ماہنامہ

ندائے اعتدال
علی گڑھ

اکتوبر ۲۰۱۸ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۴ | محرم-صفر ۱۴۴۰ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

زر خریداری

فی شمارہ	25:00 روپے
سالانہ	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبر شپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
وقف ممبر شپ (۱۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹرپرائزیز علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن ہمدرد نگر ڈی علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	تقویٰ ہی کامیابی کی ضمانت ہے	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے: سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ عیدالاضحیٰ گذر گئی مگر ہم نے کیا سبق حاصل کیا	مدیر	۳ ۵
۴۔	پیام سیرت	رزم گاہِ حق و باطل میں کردارِ نبوی	محمد فرید حبیب ندوی	۱۱
۵۔	خاص تحریر	اٹھ کہ پھر خورشید کا سامان سفر تازہ کریں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۴
۶۔	فقہی مباحث	اہل کتاب سے متعلق احکام و مسائل (قسط-۱)	محمد قمر الزماں ندوی	۱۸
۷۔	اسلامی تعلیمات	آزادی اور اسلام	نعمان بدر فلاحی	۲۴
۸۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۳
۹۔	اصلاح احوال	موجودہ مسلم معاشرے کا منظر نامہ	ابونصر فاروق	۴۰
۱۰۔	انکار حدیث	منکر حدیث ابوریہؒ کے اعتراضات	محمد فرید حبیب ندوی	۴۵
۱۱۔	افکار و نظریات	حضرت مولانا علی میاںؒ اور ان کی فقہی فکر	ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی	۵۰
۱۲۔	جدید شبہات	دین اور اس کی ضرورت	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی	۵۴
۱۳۔	درسِ عزیمت	سلطان العلماء اور علمائے سلاطین	ترجمہ: سہیل احمد ندوی	۵۸
۱۴۔	تعارف و تبصرہ	''امت محمدیہ- امتیازات و خصوصیات''	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۶۲
۱۵۔	آخری صفحہ	تم اس اللہ کو یاد نہیں کرتے جس نے تم کو پیدا کیا ہے؟	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۶۔	شعر و ادب	غزل	شعیب احسن اعظمی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ:

رواں مہینہ میں ملک کی عدالت عالیہ نے ایک ایسا فیصلہ سنایا، جس سے ہندوستان کے چپہ چپہ پر پھیلی شرم وحیا بھی اپنا منہ چھپانے لگی، برسہابرس کی تہذیب نے آنکھیں بند کرلیں، مذہب بیزار خوش ہوئے تو مذہب پسند پریشان، اپنی نسلوں کے مستقبل کو لے کر لوگوں کے ذہن میں کئی سوال ابھرنے لگے، شریف انسانوں پر تو گویا منوں پانی پڑ گیا، مگر کیا کہا جا سکتا ہے کہ سپریم کورٹ نے سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے حتی کہ آئین ہند کی دفعات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ملک میں ہم جنس پرستی کو سندِ جواز عطا کر دی، ظاہر ہے کہ ججوں نے جس نظام تعلیم اور جس فکر کے ماحول میں تربیت پائی ہے اس کا نتیجہ اس سے بھی زیادہ سنگین نکل سکتا ہے، ابھی دو روز قبل ہندی اخبار کی خبر ہے کہ ہریانہ میں ایک ہندو لڑکا اپنی بارات سے ایک دن قبل ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گیا، یہ فیصلہ ہندوستانی تاریخ کا بدترین فیصلہ ہے، مگر اس فیصلہ کے بعد مذہب کا کام ختم نہیں ہوتا، ایسے تمام جرائم پر قابو پانے کے لئے قرآن مجید کو اتارا گیا ہے، اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ قرآن مجید کو عام کیا جائے، اس کی دعوت کو پھیلایا جائے اس کی تعلیمات سے لوگوں کو واقف کرایا جائے اور اپنی نسلوں کو قرآن کے رنگ میں رنگا جائے، قرآن نے اس جرم کی تاریخ اور اس کا عبرتناک انجام بیان کیا ہے، اس کے سنگین نتائج سے آگاہ کیا ہے۔

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ پر ہم کو تعجب نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ پوری دنیا پر اس وقت مغرب کی مادی اور اخلاقیات سے عاری تہذیب کا غلبہ ہے، پہلے مغرب نے طاقت کے ذریعہ دنیا کے اکثر حصہ پر قبضہ کیا پھر بین الاقوامی کمپنیوں کو فروغ دے کر اپنی بالادستی قائم رکھی اور معاصر دنیا میں اسکی بالادستی کا راز سرمایہ کاری میں مضمر ہے، وہی اس کا ہتھیار ہے، دنیا پر اس وقت مغرب کا عسکری اقتصادی اور سیاسی تسلط ہے، ہندوستان کبھی بھی مغرب کی راہ چلنے سے پیچھے نہ رہا، مغرب کے ہر قانون کو دیر سویر یہاں جگہ ملی، مغرب کے ہر پروپیگنڈے اور روش کو یہاں آزمایا گیا، مغرب نے اسلام سے جنگ کی خاطر جب دہشت گردی کا بت تراشا اور کہا کہ ہم اسلام سے نہیں دہشت گردی سے لڑ رہے ہیں تو وطن عزیز بھی اسی راہ پر چل پڑا (اس قسم کی تفصیل کا یہ موقع نہیں باخبر قارئین سمجھ گئے ہوں گے)، ہندوؤں کے یہاں ہم جنس پرستی

کے عناصر پائے جاتے ہیں، آئے دن اخبار میں ایسے واقعات چھپتے ہیں، بابائے قوم کے قاتلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہم جنس پرست تھے، بہرحال سپریم کورٹ نے یہ تو کہا نہیں ہے کہ ایسا کرنا ہی ہے بلکہ یہ جواز کا ایک فیصلہ ہے، جس کے اثرات سے ہم کو معاشرے کو بچانا ہے۔

دراصل مغربی تہذیب حرص وہوس مادیت پسندی اور فطرت کے انکار اور فطرت سے بغاوت پر قائم ہے، مغربی مفکر thomas hobbes نے انسان کو فطرتاً شریر قرار دیا تھا، مغرب نے اس کی رائے پر ہی عمل کرنے پر اکتفانہ کی بلکہ آگے بڑھ کر اس خبیث الفطرت یہودی کی رائے کو اپنی تہذیب کا محور ومظہر بنالیا، جس مفکر freudsigmund نے انسان کو درحقیقت ایک شہوانی جانور قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایسا جانور ہے جس پر شہوانی جذبات غالب ہوتے ہے، مغربی معاشرہ انسان کی اس فطرت مخالف گھناؤنی تعریف کی تصویر نظر آتا ہے، وہاں کے متعدد معاشروں میں ہم جنس پرستی کی لعنت کو بہت پہلے قانونی جواز دیا چکا تھا، مجھے تعجب تو اس پر ہے کہ وطن عزیز کی عدالت عظمی نے مغرب کی نقالی میں اتنی دیر کیوں کی؟ اس کو تو بہت پہلے غلامانہ ذہنیت کے سبب یہ فیصلہ سنا دینا چاہیے تھا، اس موقع پر ججوں نے مغرب کے اس اصول اور فکری کجی کو دلیل بنایا، کہ آزادی ہر انسان کا اپنا حق ہے، جبکہ اسلام ہر فرد کو آزادی تو عطا کرتا ہے مگر اس کو اطاعت سے مقید کرتا ہے، اس نے جنسی تلذذ کی آزادی دی ہے لیکن اس کو کسی عورت سے نکاح کی شرط سے مقید کر دیا ہے، اسلام کی نظر میں آزادی معاشرے سے معاہدے کے مترادف ہے، معاشرے کو نظر انداز کر کے کوئی شخص اپنی آزادی کا استعمال نہیں کر سکتا، مغرب نے اس کے برخلاف آزادی کو فرد کا لامحدود حق سمجھ کر استعمال کیا تو اس کا معاشرہ تباہ ہو گیا، وہاں پھر نہ رشتے باقی رہے نہ رشتوں کا تقدس، بلکہ ماں بیٹی ایک ہی شخص سے جنسی تعلق قائم کرنے لگیں اور پھر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے بھی واقعات پیش آئے، اس تہذیب کا کیا رونا جو یہاں تک دیوالیہ ہو چکی ہو کہ ایک شخص پاخانہ کو کارٹون میں رکھے اور اس پر لیبل چسپاں کرے کہ ''ایک فنکار کا ۱۰۰ فیصد خالص Pure پاخانہ'' پھر اس کو روڈ پر لا کر رکھ دے، جی ہاں یہ مہذب امریکہ کا واقعہ ہے، سچی بات یہ ہے کہ اسلام ہی ایسی تہذیب کا مدمقابل ہے، اسی لیے وہی سب سے بڑا اس کا دشمن ہے۔

یاد رکھیے استعمار جہاں سے بھی رخصت ہوا اس نے اپنے جراثیم دستور میں، نظام حکومت وعدلیہ اور نظام تعلیم میں چھوڑ دیے، دنیا اس وقت اسی کی غلام اور اسی کے راستے پر ہے، اس لیے اصل چیلنج کو سمجھیے، اپنے گھر اور اپنے معاشرے کی فکر کیجئے، دین کی جڑیں گھر اور معاشرے میں جتنی گہری اور مضبوط کر دی جائیں گی مغربی فریب اور اسکی حیوانی وشہوانی تہذیب سے مقابلہ اتنا ہی آسان ہوگا۔

اس موقع پر مسلمانوں نے سیاسی نقطۂ نظر سے بڑی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا کہ انھوں نے اس کو محض اپنے خلاف

قرار دے کر کوئی تحریک نہیں چلائی، حالانکہ کچھ بیان بازی ہوئی مگر سلسلہ دراز نہ ہوا، اگر ایسا ہوتا تو بی جے پی بھکت میڈیا کے ذریعہ پروپیگنڈہ کرنے میں کامیاب ہوجاتی کہ دیکھو مسلمان عدالت کے بھی خلاف ہیں، ظاہر ہے کہ ہندو بھی بڑی تعداد میں اس کے خلاف ہیں، جس عرضی پر فیصلہ سنایا گیا وہ ہندو ہی کی تھی، ضرورت ہے کہ ان ہی کو آگے لایا جائے اور وہی اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔

یہ خطرہ ہے کہ اس بدترین فعل کو قانونی جواز مل جانے سے کہیں شریف خاندانوں تک بھی یہ سیلاب نہ پہنچے، اس لیے ضروری ہے کہ عذاب الٰہی کی امید لگا کر نہ بیٹھیں کہ غرق فرعون کے بعد سے ایسا عذاب نہ آیا اور پھر ہمارے اعمال بھی کچھ ایسے نہیں کہ آسمان سے نصرت کا نزول ہو، لیکن ایسے ماحول میں نصرت خداوندی کی دعا کرنا چاہیے، عافیت اور عقیدہ و اخلاق کی حفاظت کی دعا مانگنا چاہیے، سب سے اہم بات وہی ہے جس کا ذکر ہوا کہ اس سلسلہ میں دینی تربیت پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے اور خاموش محنت کرنا چاہیے، لوگوں کو قوم لوطؑ کے انجام سے ڈرانا چاہیے اور بدفعلی کے انسانی، معاشرتی، خاندانی اور اخلاقی وطبی نقصانات سے واقف کرانا چاہیے، گھروں کو مغربی تہذیب وفیشن سے حتی المقدور پاک رکھنا چاہیے ورنہ رفتہ رفتہ بے حسی، بے حیائی اور بے اخلاقی کے نتیجہ میں آئندہ نسلیں اس طرح کے جرائم کا بھی شکار ہوسکتی ہیں۔

عیدالاضحی گزر گئی مگر ہم نے کیا سبق حاصل کیا

نوٹ: یہ ہے وہ مضمون جو عید سے قبل ہم مصروفیات کے سبب نہ لکھ سکے، بہرحال عید کے بعد اس کی اہمیت اور زیادہ ہی ہوگئی کیوں کہ اس میں ہمارے لئے دعوت احتساب ہے۔

عبدالاضحیٰ آتی ہے اور گذر جاتی ہے، اس بار بھی آئی اور گذر گئی، کچھ خوش نصیب لوگوں نے اس کے لئے بڑا اہتمام کیا ہوگا، کچھ لبرل لوگوں کے لئے یہ ایک رسم رہی ہوگی جو ادا ہوگئی، کچھ کو اس کی تاریخ سے واقفیت رہی ہوگی، اس لیے انھوں نے بڑے خلوص وجذبۂ شکر کے ساتھ قربانی پیش کی ہوگی، کچھ نے گوشت کھانے کے لئے ہی قربانی کی ہوگی، مگر کی تو ہوگی خواہ دکھانے کے لئے ہی کی ہو، جی ہاں! کچھ بے چارے کئی کئی جانور قربان کرتے ہیں اور تعداد مع قیمت خوب بیان کرتے ہیں مگر ان کے غریب اعزہ واقربا ایک ایک بوٹی کو ترستے ہیں، خیر اب تو نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ کچھ لبرل قربانی کو ہی بے سود اور فضول سمجھنے لگے ہیں، ان کی نظر میں اس قدر خون بہانے سے بہتر ہے کہ یہ رقم صدقہ کی جائے، تعلیم پر خرچ کی جائے اور دوسرے قومی ورفاہی کام کیے جائیں، ظاہر ہے کہ یہ بے چارے عقل مند بلکہ عقل کے مارے جس طرح قربانی کے سماجی واقتصادی فوائد اور رفاہی پہلو سے واقف نہیں اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قربانی کے دنوں میں اللہ کو خون بہانے سے زیادہ کوئی اور عمل پسند ہی نہیں، حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے: عن عائشةؓ أن رسول

اللہ ﷺ قال: ما عمل آدمیّ من عمل یوم النحر أحب إلی الله من إهراق الدم، إنه لیأتی یوم القیامة بقرونها وأشعارها وأظلافها وإن الدم لیقع من الله بمکان قبل أن یقع من الأرض، فطیبوا بها نفساً (رواہ الترمذی،۱۴۹۳،أبواب الأضاحی) (ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: یوم النحر کو ابن آدم کا کوئی بھی عمل خون بہانے سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب نہیں، اور قربانی کا جانور اپنے سینگ، کھر، اور بالوں کے ساتھ قیامت کے دن آئے گا، اور بے شک وہ خون کے زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے یہاں مرتبہ حاصل کر لیتا ہے، پس اس کو خوش دلی سے انجام دو)۔

حقیقت میں یہ قربانی بندے کے لئے اللہ سے تعلق کے اظہار کا ذریعہ اور اس کی علامت ہے، اس کے خون اور گوشت سے خدا کو کوئی سروکار نہیں، اس کی بارگاہ میں تو وہی تعلق، وہی اخلاص اور وہی نیت پہنچتی ہے جس کے اظہار کے لیے یہ قربانی پیش کی جاتی ہے، اسی کا ارشاد ہے لن ینال الله لحومها ولا دماء ها ولکن یناله التقوی منکم (حج: ۳۷) (ترجمہ: اللہ تک ان جانوروں کا نہ خون پہونچتا ہے اور نہ گوشت، اللہ تک تو تمہارا تقوی پہونچتا ہے (اللہ کے یہاں تمہارے خلوص اور تقوی کی اصل قدر ہے)۔

یہ قربانی ایک ایسے قرآنی قصہ کی یادگار ہے جو امتحان و آزمائش کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اس میں حکم الٰہی کے سامنے دونبیوں کے سرِ تسلیم خم کرنے کی ایسی مثال بیان کی گئی ہے، ان کے صبر و استقامت اور طاعت الٰہی کا ایسا واقعہ سنایا گیا ہے جو خالق کائنات کو کچھ اس طرح بھایا کہ اسے رہتی دنیا تک کے لیے یادگار بنا دیا، امت اسلامیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ضروری ہے کہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے اس واقعہ سے واقفیت حاصل کی جائے، ملت ابراہیمی کی طرف نسبت ہے تو اس نسبت کی اہمیت کو سمجھا جائے، یہ قربانی بھی تو ملت ابراہیمی کا شعار ہے، اسی ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمدؐ کو حکم دیا تھا ثم اوحینا إلیك أن اتبع ملة ابراهیم حنیفا وما کان من المشرکین (النحل:۱۲۳) (ترجمہ: پھر ہم نے تمہیں پیغام دیا کہ اللہ کے لئے یکسو ہو کر ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، اور ان کی طرز حیات کو اختیار کرو، وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)، اس ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے احمق و بے وقوف قرار دیا تھا، ومن یرغب عن ملة إبراهیم إلا من سفه نفسه ولقد اصطفینٰه فی الدنیا وإنه فی الآخرة لمن الصالحین (بقرہ:۱۳۰) (ترجمہ: ابراہیم کی ملت اور ان کے طور و طریق سے اعراض کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو خود اپنے تئیں احمق و سفیہ ہو، ہم نے دنیا میں ان کا انتخاب کیا، اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں ہوں گے، جنہوں نے بالکل درست روش اختیار کی)۔ اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کو اللہ نے حسن اسلام اور غایتِ تدین کی علامت بنایا تھا ومن احسن دینا ممن أسلم وجهه لله وهو محسن واتبع

ملة ابراهيم حنيفا وماكان من المشركين (نساء:۱۲۵)،(ترجمہ:اس سے بڑھ کر بہتر دینداری کس کی ہے؟ جو اپنے کو نیکو کاری کے ساتھ اللہ کے حوالہ کردے،اور ملت ابراہیمی کا اتباع کرے، جو اللہ کے لئے یکسو تھے،اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل (اپنا محبّ ومحبوب) بنایا)۔اسی ملت ابراہیمی کی طرف اللہ نے اپنے نبی کو ہدایت دی تھی قل إننی هدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملة ابراهیم حنیفا وما کان من المشرکین (انعام:۱۶۱) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ میرے رب نے صحیح راستے کی طرف میری رہنمائی کی ہے، صحیح دین، صحیح نظام اطاعت اور ملت ابراہیمی کی جو مکمل طور پر اللہ کے لئے یکسو تھے،اور وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)،اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کا سب کو حکم دیا تھا قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهیم حنیفا وما کان من المشرکین (ال عمران:۹۵)(ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ کہا؛ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو، وہ اللہ کے لئے یکسو تھے، وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے)۔ چنانچہ جب یہ قربانی اس ملت ابراہیمی کا شعار ہے تو پھر لازم ہے کہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی جائے،اور یہ بھی نہ ہو کہ قربانی تو کی جائے مگر اس کے مقاصد،اس سے حاصل ہونے والے سبق کو فراموش کردیا جائے،خود عید کے مقاصد سے ہی نابلد رہا جائے،قربانی تو کی جائے مگر قربانی کے علاوہ بقیہ شعبہائے زندگی میں ملت ابراہیمی کے اتباع کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور موقف ابراہیمی کے خلاف زندگی گذاری جائے،شعائر اسلامی کی پامالی پر دل بھی نہ دکھے،زبان سے آہ بھی نہ نکلے،کفر وشرک سے اظہار براءت اس کے غلبہ اور اس کی ہمنوائی کرنے والوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت بھی نہ ہو سکے،ملت ابراہیمی سے نسبت کا تقاضا ہے کہ حضرت ابراہیم کا وہ کردار جوایثار، جرأت،حکمت: بے باکی وحق گوئی اور ببانگ دہل توحید باری کے اعلان سے عبارت ہے ہمارے سامنے ہو۔

عید درحقیقت اسلام میں اجتماعیت اور اسلامی تشخص کی علامت اور مظہر ہے،مسلمانوں کی عیدان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے،وہ ایک عید بطور شکرانۂ الٰہی مناتے ہیں تو دوسری عید میں بارگاہ الٰہی میں قربانیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں،انھیں اس کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ عید کی خوشی میں حدود شریعت سے باہر نکل جائیں،فسق وفجور کی محفلیں سجائیں، جوئے اور ناچ گانے میں مست ہوجائیں،لباس،خوشی اور عید کی پارٹی کے نام پر بے حیائی،فحاشی اور مغربی تہذیب کی نقالی سے عید کے تشخص کو برباد کردیں،کیوں کہ ان کی عید دوسروں کی عید سے ممتاز،مغائر،ممیّز، پاکیزہ،سنجیدہ و باوقار اور بہت بہتر ہے،جیسا کہ خود نبی کریمؐ نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا کہ تمہارے یہ جو دو دن کھیل کود کے لیے مختص ہیں، ان کو اللہ نے یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ سے تبدیل کردیا ہے جو ان دونوں سے بہتر ہیں، "قدم رسول اللهﷺ المدینة ولهم یومان یلعبون فیهما، فقال: ما هذان الیومان؟ قالوا: کنا نلعب فیهما فی الجاهلیة، فقال رسول اللهﷺ إن الله قد أبد لکم بهما خیرا منهما یوم الاضحی ویوم الفطر۔

اس حیثیت سے یہ بات سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی عید دین کا مظہر ہے، دین کا شعار ہے، اس کی تعظیم واحترام لازم ہے، عید میں بھی شعائر دین کی تعظیم کا لحاظ رکھنے، اجتماعی بنیادوں کو استوار کرنے اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ عید درحقیقت اپنے دینی تصور کے اعتبار سے محض شکرانۂ نعمت اور شکر الٰہی کا مظہر ہے ولتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم ولعلکم تشکرون (بقرہ:۱۸۵) (ترجمہ: اور یہ مقصود ہے کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہدایت دی ہے اس پر عظمت وکبریائی کے گن گاؤ اور تاکہ تم (اس کی نوازشوں کا) شکر ادا کرو)۔

عید کے اجتماعی، معاشرتی اور انسانی پہلو کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کو عید کا انتظار رہتا ہے، عید کی آمد سے وہ کھل اٹھتے ہیں، یہ درحقیقت ان کی خوشی کا دن ہوتا ہے، فقراء ومساکین عید کا انتظار کرتے ہیں، ان کو اصحاب ثروت کی طرف سے کچھ مدد مل جاتی ہے، اب اگر بڑے بچوں کی خوشی کا لحاظ نہ کریں، اغنیاء وفقراء کی طرف توجہ نہ کریں تو گویا عید کا یہ پہلو ان کے سامنے نہیں تھا یا پھر عید کا یہ سبق وہ بھول گئے، عید اتفاق واتحاد پیدا کرنے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے، رشتوں کی شیرازہ بندی کرنے، عفوودرگذر کا مظاہرہ کرنے، بغض وحسد سے نجات پانے اور نفرتوں کو الفتوں میں تبدیل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، عید کی انسانی اور اجتماعی حیثیت اس ناحیہ سے بہت اہم ہے، کہ عید کے دن اغنیاء طبقہ و خیرات، ہدایا وتحائف اور قربانی کے گوشت کے ذریعہ اپنے اموال سے فقراء کو دینے کا سبق یاد کریں، معاشرے کے کمزوروں پر شفقت ومحبت ورحمت کی نگاہ ڈالیں اور کیا خوب ہو کہ مالدار کمزوروں کے ساتھ اس طرح پیش آئیں جیسے اللہ نے ان پر نوازشات کی بارش کی ہے، جیسے اللہ نے ان کو دولت سے مالا مال کیا ہے، نعمتوں سے نہال کیا ہے، اللہ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: أحسن كما أحسن الله إليك ولا تبغي الفساد في الارض إن الله لا يحب المفسدين (سورہ قصص:۷۷) (ترجمہ: اچھا معاملہ کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کر رکھا ہے اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اور اللہ تعالیٰ فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔ اگر عید کے اس انسانی پہلو کو عمل میں لایا جائے تو عید کی خوشی سے ہر گھر سرشار ہوگا، ہر خاندان عید کا لطف لے گا اور اس طرح اسلامی عبادات کا انسانی واجتماعی پہلو غیروں کے سامنے آکر ان کے لیے باعث کشش اور خاموش دعوت ہوگا۔

عید پر اس پہلو سے بھی غور کیجئے، قرآن مجید کا بیان ہے إن هذه امتكم امة واحدة وأنا ربكم فاعبدون (انبیاء:۹۲) (ترجمہ: یہ تمہاری امت ایک امت ہے، اور میں تمہارا رب ہوں، پس میری بندگی کرو)۔ ذرا دیکھیے کہ عید کے دن پوری امت مسلمہ کس طرح امت واحدہ ہونے کا شعوری یا غیر شعوری طور پر پیغام دیتی ہے، کس طرح سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، گلے شکوے دور کرتے ہیں، ایک دوسرے کو کثرت سے ہدایا دیتے ہیں، اس موقع پر

بسا اوقات ہدایا کا تبادلہ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ اپنی ہی چیز گھوم پھر کر واپس آ جاتی ہے، اخلاص کی جس قدر فضیلت آئی ہے اس کی مٹھاس بڑی حد تک اس دن محسوس ہوتی ہے، یوں تو بے شمار فضیلتوں کے باوجود پڑوسیوں کے حقوق پر توجہ نہیں دی جاتی مگر عید کے دن پڑوسیت کی حس بھی جاگ جاتی ہے، یہ الگ بات کہ بعض بدنصیب شہر ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان اس دن بھی سات دروازوں میں کنڈی لگا کر گھر کے دربے میں بند رہتے ہیں، اس قدر اندر بیٹھ کر وہ دوسروں سے ملنے کے بجائے لوگوں کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اگر عید کے اس پہلو پر شعوری طور پر عمل کیا جائے تو پوری امت انعام الٰہی کا مصداق ٹھہرے گی، کیوں کہ سب کے سب امت کی اجتماعیت کو قائم کرنے میں اپنا حصہ ڈالیں گے، افراد ملت میں اجتماعیت کا احساس پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے إنما المؤمنون اخوة کی تعبیر وتفسیر عملا پیش کرنے کی کوشش میں شامل ہوں گے، اگر یہ کام کیا جائے اور شعوری طور پر کیا جائے تو یہ بڑے پیمانے پر اصلاح ذات البین کا بھی ذریعہ بن سکتا ہے، معاشرے میں اخوت ومحبت کی جڑیں مضبوط کر سکتا ہے اور بڑے پیمانے پر مؤثر انداز میں اس پیغام کو اس طرح عام کیا جا سکتا ہے، انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم واتقوا الله لعلكم ترحمون (الحجرات:(۱۰) (ترجمہ: تمام ایمان والے بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرایا کرو، اور اللہ کا لحاظ رکھا کرو (اس کی شریعت کی پابندی کیا کرو) تا کہ تم پر وہ رحم فرمائے۔

جب اخوت اسلامی کا یہ احساس پیدا کیا جائے گا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دوسروں کے درد کو محسوس کریں گے، دوسروں کی تکلیف سے انھیں تکلیف محسوس ہوگی، پھر وہ خود کو فرد ملت سمجھیں گے اور ملت پر ٹوٹنے والے آلام و مصائب کو عید کی خوشی اور دعوتوں کی لذت اور کباب وقورمہ کی کشش میں فراموش نہیں کریں گے، اس امت کو اللہ نے خیر امت بنایا ہے، امت وسط بنایا ہے، اس لیے اس کے ہر کام میں خیر نمایاں اور اعتدال کا اظہار ہونا ضروری ہے، اس امت کے اہل ایمان کی خصوصیت جناب رسالت مآب ﷺ نے یوں بیان فرمائی ہے مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد الواحد، إذا اشتكى منه عضو واحد تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى (مسند احمد/۳/۱۸۳۷، الطبعۃ الاولی ۱۹۹۹ء) (ترجمہ: آپسی محبت وہمدردی اور شفقت میں مؤمنین کی مثال ایک جسم کی طرح ہے، کہ جب جسم کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پورا بدن بے خوابی اور بخار کا شکار ہوتا ہے) اس امت کے خیر امت اور امت وسط ہونے کے اعتبار سے لازم ہے کہ خوشی وغمی، تنگ حالی وخوش حالی، مصیبت و فرحت کا کوئی موقع ہو مگر اس کا اعتدال نمایاں ہو کر سامنے آئے، ایک طرف اگر عید کے موقع پر عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو تو دوسری طرف محروم دنیا کو خوشی میں شریک کرے، اور نظر فلسطین وشام اور دیگر مسلم ممالک کے مظلوم ومقہور و بے بس مسلمانوں کی محرومی پر رکھے اور زبان سے ان کے لیے دعا کرے کہ اللہ ان کے مصائب دور کر دے اور آئندہ

عید ہماری طرح ان کے لیے بھی خوشیوں بھرا پیغام لے کر آئے۔

عیدیں آتی ہیں گذر جاتی ہیں، اسی طرح اس مرتبہ بھی عید قرباں آئی اور گذر گئی، مگر سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم نے اس کے پیغام کو سمجھا، کیا عید ہمارے لیے شعور کی بیداری، جذبۂ اخوت ومحبت کو جنم دینے کا ذریعہ بنی، کیا ہماری عید اس طرح مظہر اعتدال ووسطیت بن سکی کہ ہم اپنی خوشی کا اظہار بھی کریں اور دوسرے بھائیوں پر مظالم ومصائب کو بھی محسوس کر سکیں، کیا ہم نے معاشرے کے کمزوروں کو اپنے دسترخوان پر بلایا، کیا ہم ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے ملنے گئے، کیا ہم نے غریبوں کی مدد کی، ان کے گھر بھی اچھا کھانا پک جائے، اس کی فکر کی، گھر کے نوکر کے بچے بھی نئے کپڑے پہن لیں اور ہمارے بچوں کی طرح خوشی منالیں، یہ احساس جاگا، کیا ہمارے اندر ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کی ملت کے اتباع کا احساس جاگا، کیا ان کے صبر واطاعت واستقامت اور راہ خدا میں حکم الٰہی کے سامنے اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے واقعہ سے ہمارے اندر بھی اطاعت واستقامت کا کچھ جذبہ پیدا ہوا، یا یہ عید بھی گوشت کھانے پکانے اور قربانی کے جانور کے محفل در محفل تذکرے کرنے میں گزر گئی، اگر اب تک ہم نے غور نہیں کیا ہے، قربانی کی حقیقت، عید کے پیغام محبت واجتماعیت اور اس کے معاشرتی وانسانی پہلو کو نہیں سمجھ سکے ہیں تو پھر ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ آئندہ عید آنے سے قبل ہم اپنے اور اپنے اہل خانہ کے اندر یہ روح پیدا کر لیں، تاکہ آئندہ ہماری صحیح معنی میں عید ہو سکے اور ہم انفرادی طور پر عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی احساس کو فروغ دینے اور مقاصد عید کو عام کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑پیام سیرت

رزم گاہِ حق و باطل میں کردارِ نبوی

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''اے اللہ! اگر آج تو نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا''۔

رات کی مہیب تاریکیاں ہر سُو چھائی ہوئی تھیں۔

بدر کے میدان میں دونوں طرف فوجیں نیند کی آغوش میں جا چکی تھیں۔

صبح ایک سخت معرکہ ہونے والا تھا۔

تاریخ انسانی کا سب سے سخت معرکہ!

قلت و کثرت اور ساز و سامان کا ایسا تضاد چشم فلک نے کب دیکھا ہوگا!

ایک طرف جنگی اسلحے تھے.....منظّم فوج تھی.....ٹرینڈ شہسوار تھے۔

دوسری طرف ہتھیار کچھ نہ تھے.....بس ٹوٹی پھوٹی اور زنگ آلود تلواریں.....اور گھوڑے دو تھے۔

ایک طرف ہزار کی جمعیت تھی.....دوسری طرف تین سو تیرہ!

یوں تو رات ہوتی ہی بھیانک ہے.....مگر.....آج تو اس کی ہیبت ناکی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

دل سینوں میں کانپ رہے تھے۔

اور اِس وقت جب کہ سب نیند کی باہوں میں چین سے سو رہے تھے تاکہ صبح کے لیے تازم دم ہو سکیں۔

وہ اکیلا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی جاگ رہا تھا۔

اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہا تھا۔

''اے میرے پروردگار! تو نے مجھ سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے.....دیکھ آج مجھے رسوا نہ کر دینا''۔

''اے اللہ! یہ مٹھی بھر لوگ میں نے تیرے سامنے لا کے ڈال دیے ہیں''۔

''بس یہی تیرے بندے ہیں.....باقی تو تجھے کوئی نہیں پہچانتا''۔

''اگر آج یہ بھی مارے گیے.....تو.....قیامت تک تیرا نام لیوا کوئی نہ ہوگا''۔

وہ روئے جا رہا تھا.....اپنے مولی کو دل کا درد سنا رہا تھا.....اس کے کیے ہوئے وعدوں کا واسطہ دے رہا تھا۔

یہ تین سو تیرہ بھی اس نے کس مشقت سے جمع کیے تھے!

پندرہ سال لگے تھے اسے یہ لعل و گہر جمع کرنے میں.....پندرہ سال!

اس پندرہ سالہ دور کے ایک ایک لمحے کی کمائی تھے یہ تین سو تیرہ!

اِن کے لیے کتنے پتھر کھائے تھے اس نے.....کتنے درد سہے تھے.....کتنے طعنے سنے تھے.....خون اور پسینے کی کتنی بوندیں ٹپکائی تھیں اپنے بدن سے!

اِنھیں جمع کرنے کے لیے ہی تو اس نے سمیہ کو کھویا تھا.....یاسر کی تکلیفیں دیکھی تھیں.....بیٹیوں کے رشتے ٹوٹتے دیکھے تھے.....!

اِن کے لیے ہی تو اس نے طائف کے زخم برداشت کیے تھے!

اگر آج یہ سب ہی مٹا دیے جاتے تو اس کی پندرہ سالہ محنت کا کیا ہوتا!

پھر پندرہ سالہ ہی کیوں.....ان پر ہی تو مستقبل کا انحصار تھا۔
یہ پندرہ سال تو قیامت تک کے دور کی تمہید تھے۔
اِس لیے آج وہ انھیں بچانے کی ہر ممکن تدبیر کر رہا تھا۔
وہ اسباب و وسائل کی طرف سے بھی غافل نہ تھا۔
جتنے اسباب جمع ہو سکتے تھے.....وہ سب کر چکا تھا۔
اور سب کچھ کر چکنے کے بعد اب وہ اُس کے سامنے پیشانی رگڑ رہا تھا۔
وہی تو سب کا سہارا ہوتا ہے۔
وہی تو حق کا محافظ ہے۔
اُسی نے تو اسے یہ کام سونپا تھا۔
اُسے درد نہ سناتا.....تو کسے سناتا؟
اُس سے نہ مانگتا.....تو کس سے سوال کرتا؟
سب سو گئے.....مگر اس کی بے قراری نے اسے سونے نہ دیا۔
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے دردِ دل کا!
کوئی ناپ سکتا ہے اُس کے سوزِ دروں کو!
کہنے والے بس اتنا ہی کہہ سکے کہ وہ 'متواصل الاحزان..دائم الفکر' تھا۔
رات بھر دعائیں کر چکنے کے بعد صبح کو اس نے لشکر ترتیب دیا.....صفیں درست کیں۔
اور پھر اس کی بے قراری قابل دید تھی۔
کبھی صفوں کے بیچ دوڑتا پھرتا.....کبھی اِسے سمجھاتا کبھی اُسے بتاتا.....اور پھر دوڑ کر اپنی جھونپڑی میں آتا اور اپنے مولی سے لَو لگاتا۔
ایک بار تو بہت دیر ہوگئی .....وہ جھونپڑی میں ہاتھ اٹھائے آنسو بہا رہا تھا اور ادھر جنگ جاری تھی۔
صدیق اکبر نے دیکھا کہ وہ کہیں نظر نہیں آتا.....۔
وہ دوڑے ہوئے عریش مبارک کی طرف گئے۔
دیکھا کہ وہ مدہوشی کے عالم میں راز و نیاز میں مشغول ہے۔
اور اسے اتنا بھی احساس نہیں کہ اس کی رداء مبارک اس کے مقدس شانے کو چھوڑ کر نیچے سرک چکی ہے۔
صدیق سے رہا نہ گیا.....آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔
''اے اللہ کے رسول! اب بس بھی کیجیے.....آپ کا رب اپنے وعدے کو پورا کرے گا''۔ پیچھے سے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے کہا۔
یہ کفر و اسلام کی پہلی جنگ تھی۔
کفر آج اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ آیا تھا۔
باطل سارے ہتھکنڈے اپنا کر محاذ تھامے ہوئے تھا۔
اسلام نے بھی اپنے جگر کے ٹکڑے آگے کر دیے تھے۔
مادی نظر میں اسلام کمزور و بے بس تھا اور کفر طاقتور و زور آور۔
یہ جنگ بھی تاریخ انسانی کی سب سے انوکھی جنگ تھی۔
آج باپ بیٹے کے مقابل تھا.....بیٹا باپ کے۔
بھائی کی تلوار پر بھائی کی گردن تھی۔
ماموں کی نگاہوں کے سامنے بھانجے کا سر تھا اور ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار۔
آج رشتے رشتوں سے ٹکرا رہے تھے۔
اور عجیب بات یہ ہے کہ آج ایک رشتے نے سارے رشتوں کو مات دے دی تھی۔
آج بس کفر و اسلام کا رشتہ تھا۔
نہ یاری دوستی.....نہ خونی رشتے.....نہ سسرالی و دامادی تعلقات۔
آج جو کچھ تھا وہ حق و باطل کے دو لفظوں میں سمٹ آیا تھا۔
ایک طرف اللہ کی فوج تھی.....دوسری طرف شیطان کا لشکر تھا۔
ایک طرف ابوجہل و عتبہ تھے.....دوسری طرف علی و حمزہ تھے۔
اللہ کا نبی یہ سب دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر گھلا جا رہا تھا۔
''یہ ہمارے بھائی بند ہی تو ہیں.....کیوں یہ حق کی دشمنی پر اتر آئے ہیں.....یہ حقیقت کو سمجھتے کیوں نہیں.....یہ میرے سازِ دل کو سنتے کیوں نہیں.....''۔ وہ یہی سوچ رہا تھا۔
مگر آج اسے اپنا جلال بھی دکھانا تھا.....کفر کے تابوت میں نکیل بھی ٹھوکنی تھی.....باطل کے اژدہے کو اپنے پیروں سے

کچلنا بھی تھا۔

اسے آج رسول کے ساتھ ساتھ فوجی جرنیل کا رول بھی ادا کرنا تھا۔

اور دنیا نے دیکھا کہ جیسے وہ افضل رسول تھا.....ویسے ہی افضل جرنیل بھی تھا۔

کفر کا لشکر اس کی للکار کے سامنے ٹک نہ سکا۔

خدائی مدد ضرور آئی .....فرشتے بھی مدد کو اترے.....مگر.....اس کے قائدانہ رول کی اہمیت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

گو اس کے پاس وسائل کی فراوانی نہ تھی.....مگر.....اس نے آج ہر ممکن مادی تدبیر بھی استعمال کی۔

چشموں پر قبضہ کیا.....آس پاس کے کنویں بے کار کردیے.....بارش برسی تو مٹی سے چھوٹے چھوٹے حوض بنالیے.....اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دست مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کیں۔

اور جو کچھ کمی تھی.....اس کے لیے مالک ارض وسماء کے دربار میں عرضی لگائی۔

اور پھر دنیا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

ایسا نتیجہ .....جو تاریخ، قیاس اور اندازے.....سب کے خلاف تھا۔

دنیا حیران تھی اور آج تک ہے کہ ایسی کیا چیز تھی جس نے بے سروسامان تین سو تیرہ کو سامانِ جنگ سے مالا مال ایک ہزار کو شکست فاش دے دی۔

لیکن اگر حقیقت شناس دماغ ہو تو..... یہ فلسفہ چٹکیوں میں حل ہوجاتا ہے۔

اسباب ووسائل کی قوت سے کہیں زیادہ نظریے اور یقین کی طاقت ہوتی ہے۔

اور اسے کون نہیں جانتا کہ محمد ﷺ نے اپنے صحابہ کے سینوں میں یقین کی آگ لگا رکھی تھی۔

ان سے مردوں کی مسیحائی کا کام آتا تھا اور انھوں نے مردوں میں یقین کی روح پھونک دی تھی۔

وہ اُس یقین اور عقیدے کے لیے چٹانوں کو پاش پاش کر سکتے تھے.....ایک ہزار فوج کی تو اوقات ہی کیا ہے!

وہ اس کے لیے اپنے راستے سے پہاڑوں کو کھسکا سکتے تھے..... یہ تو محض چند انسانوں کی چند صفیں تھیں۔

یہ دن تاریخ اسلام میں فرقان ثابت ہوا۔

کفر کا زور ٹوٹ گیا اور اسلام کا راستہ پہلے سے کچھ آسان ہوا۔

اس واقعے میں ہمارے لیے کئی سبق ہیں:

ایک یہ کہ دنیا کی زندگی میں اسباب ووسائل سے بھاگنا اور بس دعا پر اکتفا کرنا..... یا توکل توکل کے الفاظ چبانا.....نبوی مزاج سے میل نہیں کھاتا۔

محمد ﷺ نے نبی ہوتے ہوئے بھی اور نصرت خداوندی پر یقین کے باوجود..... ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔

اسی طرح صرف وسائل پر اکتفا کرنا اور دعا کا سہارا نہ لینا..... یہ بھی نبوی مزاج کے خلاف ہے۔

آپ ﷺ نے سارے حیلے اختیار کرنے کے باوجود دعا کا دامن نہ چھوڑا۔

رات میں جب سب سو رہے تھے .....تب بھی آپ..... مناجات میں مشغول تھے۔

جنگ کے وقت بھی ساری بھاگ دوڑ کے ساتھ ساتھ بارگاہ الٰہی میں دست دعا دراز کیے ہوئے تھے۔

اور سب سے اہم سبق یہ ہے کہ اگر اپنے نظریے پر ہمارا یقین پکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دی سکتی۔

آج مسلمان قلتِ اسباب کا رونا روتے ہیں.....جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے عقیدے پر عدم اطمینان ہے۔

وہ ایمانی تزلزل کا شکار ہیں.....اس لیے مغلوب ہیں۔

جس دن انھیں یقین ایمانی حاصل ہوجائے گا.....ایک بار پھر تین سو تیرہ ایک ہزار کو شکست کا مزہ چکھائیں گے۔

☆☆☆

❑ خاص تحریر

حیدرآباد میں انگلش میڈیم دینی درسگاہ کا قیام

اٹھ کہ پھر خورشید کا سامان سفر تازہ کریں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اہل علم کی بزم اور دردمندوں کی محفل اس دنیا میں ہمیشہ سجتی رہی ہے ہمیشہ علم وادب کے نجوم وکواکب ضوافشانی کرتے رہے ہیں لیکن حال میں یہ بزم حیدرآباد میں میسکو کے آفس میں سجائی گئی۔یعنی ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار حیدرآباد میں ہر مسلک اور مکتب فکر کے علماء نے انگلش میڈیم دار العلوم قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ مستقبل میں ایسے علماء سامنے آسکیں جو برادران وطن کے درمیان انگریزی زبان میں اسلام کی ترجمانی کرسکیں ان کے اعتراضات کا جواب دے سکیں۔کام کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے عصر سعادت یعنی عہد نبوی اور اس کے بعد ایک صدی تک کا مطالعہ کرنا ہوگا جب دین کی دعوت کا کام عرب اور اس کے گرد وپیش میں اتنی طاقت کے ساتھ ہوا کہ بہت سے ملکوں کی غالب اکثریت نے اسلام قبول کرلیا اور ان کی زبان تک بدل گئی، عربی ہوگئی۔ یہ اللہ تعالی کا فیصلہ تھا کہ جس دین اسلام کو اب قیامت تک رہنا ہے اسے مضبوط پوزیشن حاصل ہوجائے، اور اس کی بنیاد مستحکم ہوجائے۔آج سرزمین حجاز کے گرد وپیش کے ملکوں، مصر وشام وعراق وفلسطین ایران اور افریقی ممالک، مراکش الجزائر تیونس وغیرہ کی زبان عربی ہے اور وہاں کی غالب ترین آبادی مسلمان ہے دعوت کے میدان مین یہ عظیم کامیابی اس لئے حاصل ہوئی کہ قوموں سے لسان قوم میں رابطہ قائم کیا کیا تھا۔ دنیا کے نقشہ پر اسپین ایک ایسا ملک ہے جہاں سے اسلام کو اور مسلمانوں کو نکال دیا گیا جہاں اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ پیش آیا اور جن لوگون کی نظر حالات پر ہے انکا کہنا ہے کہ ہندوستان بھی اسپین کے نقش قدم پر ہے۔ اہل علم اور تاریخ کے طالب علم واقف ہیں کہ ہندوستان اور اسپین دونوں جگہ مسلمان اقلیت میں رہے اور دونوں جگہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی اور ان دونوں جگوں کی سرزمین کے چپے چپے پر مسلمانون کی عظمت کے نشان ثبت ہیں لیکن دونوں جگہ مقامی آبادی کے درمیان دعوت کے کام میں کوتاہی ہوئی، اہل علم کے لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ دونوں جگہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کیسے کی، اسپین میں ۱۵۰۲ء میں شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازبیلا نے ایک فرمان کے ذریعہ ملک میں دین اسلام کی پیروی کی ممانعت کردی، ان آٹھ صدیوں میں وہاں مسلمانوں نے علوم وفنون کے چراغ جلائے، تہذیب وتمدن کو پروان چڑھایا اور اپنی علمی برتری اور صلاحیتوں کا رعب قائم کردیا اور اسی کے ساتھ ساتھ طارق بن زیاد کی تلوار کی دھاک جم چکی تھی اہل اندلس کو اندازہ تھا کہ مسلمان ہر اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتے ہیں اندلس کی مقامی ابادی

مسلمانوں کے مقابلہ میں شدید احساس کمتری کا شکار تھی اور خائف رہتی تھی، باہر سے آئے ہوئے عرب مسلمانوں نے اندلس میں دعوت وتبلیغ کا وہ پر جوش کام نہیں کیا جو انہوں نے جزیرۃ العرب کے گرووپیش میں انجام دیا جس کی وجہ سے ملک کے ملک مسلمان ہوگئے اور انہوں نے عربوں کی زبان اختیار کرلی اوران کے مذہب کو اپنا لیا۔ اس کے مقابلہ میں اسپین میں مقامی آبادی نے کم اسلام قبول کیا، کچھ یہودیوں نے قبول کیا تھا جو عیسائیوں کے ظلم وجور کا شکار ہورہے تھے اور افریقہ کے مسلمان ملکوں میں جاکر پناہ لیتے تھے اور کچھ اندلس کی مقامی آبادی نے مسلمان عربوں کے اخلاق وکردار کو دیکھ کر اوران کی طاقت سے مرعوب ہوکر بھی اسلام قبول کیا، حکومت اور حکمرانی کا دبدبہ بہت موثر ہوتا ہے اور لوگ از خود بغیر جبر واکراہ کے حاکم کا مذہب قبول کرتے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی اسپین میں مسلمانوں اور مقامی آبادی کے درمیان فاصلہ تھا اور کمیونیکیشن گیپ تھا اور مسلمان حاکم تھے مگر ہمیشہ اقلیت میں رہے اور پھر وہ وقت آیا کہ عیسائی حکومتوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو اسپین سے نکال دیا۔ اسپین میں اور ہندوستان میں بڑی مماثلت ہے یہاں بھی مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی اور یہاں وہی خطرات سامنے آگئے ہیں جو اسپین میں سامنے آئے تھے اور آخر کار مسلمانوں کا مکمل انخلا عمل میں آیا تھا اور مسلمانوں کی حکمرانی کا سورج ڈوب گیا تھا۔

اندلس کی طرح جب مسلمانوں نے یہاں ہندوستان میں اپنے قدم جمائے تو ان کی رگوں میں تازہ دم قوم کا خون دوڑ رہا تھا انہوں نے صرف اسلامی علوم وفنون کی آبیاری نہیں کی بلکہ اندلس کی طرح سائنس، صنعت، تمدن وتہذیب کو بھی مالا مال کیا اگر اندلس میں مدینۃ الزہراء اور مسجد قرطبہ کی تعمیر کی تو ہندوستان میں تاج محل اور قطب مینار اور جامع مسجد کی تعمیر کی، زراعت اور باغبانی اور مغل گارڈن کی طرح خوش نما پھولوں کے چمن کو ترقی دی اور تہذیب وتمدن میں شائستگی کا، خوبصورتی کا، اور عدل وانصاف کا اور حکمرانی کے نظام کا اعلی نمونہ پیش کیا، جس سے یہاں کی قوموں کا متاثر ہونا فطری تھا، اسلام اس ملک کے لئے نیا عقیدہ نیا نظام حیات اور توحید ومساوات کا نیا نظریہ تھا جو مقامی آبادی کے ایک طبقہ کے لئے باعث کشش تھا، اسلام کے ماننے والوں کا رعب ہر اعتبار سے طاری تھا یہی وہ عوامل تھے اور ان عوامل کے ساتھ صوفیائے کرام کے اثرات جن کی وجہ سے مسلمانوں کی حکومت اقلیت میں ہونے کے باوجود صدیوں تک باقی رہی، لیکن جس طرح سے اسپین میں مقامی آبادی کے ساتھ مسلمانوں کا دعوتی رابطہ نہ ہوسکا ہندوستان میں بھی مقامی آبادی میں اسلام کے تعارف اور دعوت کا کام نہیں ہوسکا اس لئے مصر وشام وعراق وایران کے برعکس مسلمان یہاں ہمیشہ اقلیت میں رہے، مسلمان علماء نے اصلاح کے لئے اور تزکیہ نفس کے لئے مسلمانوں کو مخاطب بنایا غیر مسلموں کو اپنا مخاطب نہیں بنایا، حالیہ عرصہ میں مسلمان علماء صرف لسان المسلمین (اردو) کا استعمال کرتے رہے لسان قوم کا نہیں، جب کہ ہر پیغمبر لسان قوم کو رابطہ کی زبان بناتا ہے۔ لسان المسلمین کا استعمال مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کے لئے تو درست ہے ابنائے وطن کو خطاب کرنے کے لئے نہیں، ہماری اس غلطی کا نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ لینگویج گیپ اور کمیونیکیشن گیپ پیدا ہوگیا اور مسلمان علماء برادران وطن کی زبان میں خطاب کرنے سے قاصر ہوگئے، اب اس ملک کو اسپین بنانے کی کوشش شروع ہوچکی ہے، موب لنچنگ یعنی ہجومی

تشدد کے واقعات بڑھتے جارہے ابھی چند روز پہلے دہلی کی ایک دینی درسگاہ کے ہوسٹل کے طلبہ کو زندہ جلانے کی کوشش ہوچکی ہے، ہندوستان کی ایک ریاست آسام کے تقریبا چالیس لاکھ شہریوں کو بیک جنبش قلم شہریت سے محروم کردیا گیا ہے،تقریبا ایک چوتھائی ووٹروں کو ملک کے مختلف حصوں سے نکال دیا گیا ہے،اس ملک کے مسلمان کو روہنگیا بنانے کی تیاری ہورہی ہے آزادی کے بعد سے اس ملک میں جتنے ماہ وسال گذرے ہیں، وہ سب جفائے یار کے نام پر گذرے ہیں راحت اورامن وعافیت اور خیر سگالی کے نام سے جو ماہ وسال رقم ہوں وہ ابھی تک خواب ہیں،ان تمام مسائل کا حل ہے مسلمانوں کا امپاورمنٹ، اور امپاورمنٹ کے لئے بہت سے کام درکار ہیں،ان میں ایک اہم کام ہے برادران وطن سے رابطہ قائم کرنا،خیر سگالی کے لئے بھی اور دعوت کے لئے بھی، اس ملک میں مسلمانوں سے غلطی وہی ہوئی ہے جو اسپین میں ہوئی تھی اور وہ غلطی ہے برادران وطن سے دعوتی رابطہ قائم نہ کرنا اورصرف ان پر حکومت کرنا اگرچہ مسلمانوں کی یہ حکومت عادلانہ حکومت تھی، برادران وطن کو مخاطب بنانے کے لئے یا ان کے درمیان اسلام کے تعارف کے لئے اور دعوتی مقصد کے لئے لسان قوم کو واسطہ اور ذریعہ بنانا پیغمبرانہ سنت ہے، اب اگر یہ باتیں درست ہیں اور ہم نے ماضی میں کوتاہی کی ہے تو اس کوتاہی کو اور اس غلطی کو ٹھیک کرنے کا وقت آگیا ہے جو مدتوں سے ہم کرتے آئے ہیں،ہماری حالیہ تاریخ میں ہندوستان میں جلیل القدر علماء پیدا ہوئے ان ناموں میں ہمیں ڈاکٹر حمید اللہ کا ایسا نام ملتا ہے جنہوں نے فرانس میں رہ کر اسی طرح لسان قوم میں کام کیا جس طرح پیغمبر لسان قوم میں کام کرتے ہیں،انہوں نے فرانسیسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور فرانس میں ہزاروں لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ مولانا علی میاں بھی اس حیثیت سے نمونہ بن سکتے ہیں کہ انہوں نے ضرورت کا احساس کرکے برادران وطن کو خطاب کرنے کے لئے پیام انسانیت کی تحریک چلائی، اصل مقصد برادران وطن کے درمیان اور اقوام عالم کے درمیان اسلام کا تعارف ہے، چونکہ انگریزی ہمارے ملک کے تمام خطہ میں اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان ہے اس لئے فی الوقت انگریزی میڈیم دینی ادارہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور ہمارا ہدف ایسے علماء کی سپاہ تازہ میدان میں لانا ہے جو انگریزی زبان وادب سے لیس ہوں جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بورپ اور امریکہ میں اس زبان کے ذریعہ دین اسلام کی اشاعت کا کام انجام دے سکتے ہوں، یہ وہ کام ہے جس کا خواب علامہ شبلی نے دیکھا تھا شاید اب اس خواب کی تعبیر کا وقت آگیا ہے،مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے کہ ''میں نے ایک مرتبہ علامہ شبلی سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے مثلا جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی؟ تو علامہ شبلی نے فرمایا: عجیب بات کہتے ہو اگر فقہاء انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کرتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کئے ہوئے غلط سلط ترجمے عدالتوں میں سند قرار پاتے؟''۔مولانا شبلی کو بہت اصرار تھا کہ انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف علماء کی ضرورت ہے،عبرت کے لئے ایک واقعہ ذکر کیا جاتا ہے چند برس پیشتر انگلینڈ کے نومسلم دینی تعلیم کے حصول کے شوق میں ہندوستان آئے تھے وہ پورے ہندوستان گھومنے کے بعد ناکام اور نامراد واپس چلے گئے تھے ان کا غنچہ آرزو کھل نہیں سکا کیونکہ ہر جگہ ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی،اب نئے ادارہ کے قیام

سے ایسے تشنہ کام اشخاص کی سیرابی اور مقصد برآری کا بھی سامان ہوسکے گا۔ حیدرآباد کی منصوبہ ساز شخصیتوں نے اس کا نام کلیۃ العلوم الاسلامیۃ (اسلامک کالج انگلش میڈیم) رکھا ہے یہ ایک ایسی تعلیم گاہ ہوگی جس کا نصاب تعلیم مشرقی اور ذریعہ تعلیم مغربی ہوگا، یہاں سے فارغین انگریزی زبان میں درس قرآن دے سکیں گے اور سیرت کی مجلسیں منعقد کرسکیں گے، برادران وطن کے اعتراضات کا انگریزی میں جواب دے سکیں گے اور پورے اعتماد کے ساتھ دنیا کے ملکوں میں اسلام کی خدمت انجام دیں گے، ایسے علماء میں نہ جمود وتعطل ہوگا اور نہ زمانہ کے تقاضوں سے بے خبری ہوگی، شہر حیدرآباد کے نامی گرامی علماء یونیورسیٹی کے مسلم اساتذہ، اور ایم۔ ایس۔ اسکول اور میسکو کے تعلیمی ادارے چلانے والے ذمہ دار حضرات اور دانشور سب اس کی تاسیس کے پروگرام میں شریک رہے ہیں جب تک تعمیر مکمل نہ ہوجائے گی ایک خوبصورت عمارت بھی کام کے آغاز کے لئے حاصل ہوگئی ہے اس ادارہ میں داخلہ کے لئے کم ازکم انٹر پاس کی شرط رکھی گئی ہے، اس اہم اور با مقصد ادارہ کے قیام کی حالیہ مشاورتی نشست میں تنخواہوں اور دیگر مصارف کے لئے اور تدریجی طور پر تعمیری کاموں کے لئے ماہانہ چار لاکھ کا بجٹ پیش کیا گیا ہے یہ بہت بڑے مقصد کے لئے بہت چھوٹا بجٹ ہے، مسلم این۔ آر۔ آئی۔ اور بیرون ملک کام کرنے والے کچھ افراد یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں جو لوگ وقف کے عظیم اجر وثواب سے واقف ہیں وہ صدقہ جاریہ کے لئے کوئی عمارت اور جائداد وقف کرسکتے ہیں، جو لوگ مالی تعاون کرنا چاہتے ہیں وہ مولانا رحیم الدین انصاری (دارالعلوم حیدرآباد) سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں، ادارہ کی تشکیل وتعمیر کے لئے ان ہی کو جنرل سکریٹری بنانے کی تجویز سامنے آئی ہے کیونکہ وہ ایک مدرسہ کے ذمہ دار بھی ہیں اور ان کا اپنا عصری تعلیم گاہ کا پس منظر ہے اور وہ دار العلوم کی خوبصورت لائبریری کی دوسری منزل اس عظیم کام کیلئے دینے کے لئے تیار ہوگئے ہیں، راستہ کی رکاوٹوں کا علم ہے، دشواریوں کا اندازہ ہے لیکن اگر ایک بار اہل ہمت نے اپنی بلند ہمتی کو آواز دی اور رکاوٹوں کے باوجود ادارہ قائم کرلیا اور سب کی کوششوں سے اس ادارہ سے دو تین بیچ فارغ ہوکر نکل گئے اور انگریزی زبان کے ذریعہ اسلامی موضوعات پر تقریر وتحریر پر قادر علماء سامنے آگئے تو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے ملکوں میں ایسے قابل علماء کی ایسی زبردست طلب سامنے آئے گی کہ اس طلب کے لئے رسد موجود نہیں ہوگی اور اس طرح کے کئی ادارے قائم کرنے پڑیں گے۔ یہ صرف ایک ادارہ کا قیام نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی طاقت اور ترقی اور روشن مستقبل کی تمہید ہے، اس لئے دامے درمے قدمے سخنے اس کی اعانت ضروری ہے۔

اس ادارہ کا قیام تعلیم کے آسمان پر ایک نئے ستارہ کا طلوع ہونا ہے ہم سب ہاتھ اٹھائیں کہ اللہ تعالی اشاعت اسلام کے اہم مقصد کے لئے اس ادارہ کے قیام میں آسانیاں پیدا کرے اور اس کام کو قبولیت سے نواز دے اور اصحاب خیر کے دلوں کو اس کے لئے کھول دے اور اسے ہر مکتب فکر کے علماء کا تعاون حاصل ہو۔

☆☆☆

❑ فقہی مباحث (قسط-۱)

اہل کتاب سے متعلق احکام ومسائل

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ پرتاپ گڑھ

تمہید:

اسلام ایک مکمل دین اور کامل دستور العمل ہے، یہ عالمگیر اور آفاقی دین ہے، جس کے اندر ہر طرح کے حالات میں صحیح رہنمائی کی صلاحیت موجود ہے، اور یہ آخری شریعت ہے جس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل ومشکلات کا شرعی حل ہے، اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔ الیوم أکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا" آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ کو اسی لئے مختلف صبر آزما حالات سے گزارا گیا، تاکہ امت کے لئے ہر طرح کے حالات میں آپ ﷺ کا اسوۂ مبارک موجود رہے، جسے وہ (امت محمدیہ) اپنے لیے مشعلِ راہ بنا سکے، مذہب اسلام جس طرح اپنے متبعین اور پیروکاروں کی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے غیر مسلموں اور اہل کتاب کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے احکام ومسائل کو بھی پوری طرح واضح کرتا ہے، چونکہ عصرِ حاضر میں دنیا کے اکثر حصوں اور خطوں میں انسان ایک کثیر مذہبی معاشرہ میں زندگی گزارتا ہے، جہاں مختلف اقوام ومذاہب کے ماننے والوں کے درمیان سماجی تعلقات پائے جاتے ہیں، اور آپس میں میل جول کا ماحول بھی رہتا ہے، اس لئے ان کے درمیان بہت سے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، بعض مسائل تو وہ ہیں جس کی رہنمائی قرآن اور حدیث نے کر دی ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین کے بہت سے احکام جدا ہوں گے اور بہت سے احکام مشترک ہوں گے، اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہوگا، ان کا ذبیحہ حلال ہوگا، اس کے برعکس مشرکین کا ذبیحہ حرام اور ناجائز ہوگا اور ان کی عورتوں سے نکاح بھی حرام ہوگا، مجوسیوں اور ذمیوں کے احکام کی بھی پوری تفصیلات قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کے ذخیرے میں موجود ہیں، اہل مجوس کے بارے میں ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا سنوا بهم سنة اهل الكتاب غير ناكحي نساء هم ولا آكلي ذبائهم، اس حدیث سے بھی بہت سے مسائل کا استنباط ہوتا ہے کہ مشرکین اور مجوسیوں میں بھی بعض مسائل میں فرق رکھا گیا ہے اور مذکورہ دو چیزوں کو چھوڑ کر اہل مجوس سے اہل کتاب جیسا معاملہ برتا جائے گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل کتاب سے متعلق بہت سے مسائل عصر حاضر کی ایجادات ہیں، نیز بہت سے باطل فرقے ہیں جنھوں نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر رکھی ہے،

جہاں وہ ایک طرف قرآن و حدیث کو تسلیم کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو رسول مانتے ہیں وہیں دوسری طرف قرآن (جو کہ آخری الہامی کتاب ہے) کے ساتھ اور آپ ﷺ کے نبی ماننے کے ساتھ آپؐ کے بعد بھی نبی کے آنے کے قائل ہیں (نعوذ باللہ)۔ کیا یہ لوگ بھی اہل کتاب میں شامل ہوں گے؟ ان کی آنے والی نسلوں کا کیا حکم ہوگا؟ اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں، جن کا حل پیش کرنا اصحاب علم وتحقیق اور ارباب افتاء کی ذمہ داری ہے۔ ذیل میں ''اہل کتاب اور ان سے متعلق احکام'' کے موضوع پر جو سوالات احقر کے نام آئے ہیں ان سوالات کے جوابات قرآن و حدیث، آثار صحابہ، ائمہ متبوعین اور سلفِ صالحین کے اجتہادات سے استفادہ کرتے ہوئے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بیسویں صدی کے اختتام میں نئے مسائل کے حل کا فقہ اکیڈمی انڈیا نے جو بیڑا اٹھایا تھا اور جس ذمہ داری کو اپنے کندھے پر لیا تھا یقیناً وہ قابل ستائش اور لائق تحسین ہے خدا اس اکیڈمی کی حفاظت فرمائے، نظر بد سے بچائے، ارباب انتظام کو مزید حوصلہ دے اور اس کے بانی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ آمین۔

اہل کتاب کی تعریف کیا ہے؟

اہل کا لفظ عربی زبان میں ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں باہم اتحاد و یک جہتی کا کوئی رنگ پایا جائے، مثلاً وہ دین، نسب، پیشہ، مکان اور شہر وغیرہ میں مشترک ہوں۔ (مفردات القرآن) کتاب کا لفظ کتب سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں اس نے جمع کیا۔ اور کتاب کے معنی ہیں وہ تحریر جو فی نفسہ مکمل ہو۔ لفظ کتاب انبیاء کی وحی پر خواہ وہ لکھی ہو یا نہ ہو بولا گیا ہے۔ (مفردات) اس کے ساتھ ہی اس کا استعمال قوانین الٰہیہ پر بھی ہوا ہے۔ (۸الأنفال ۶۸:۹، التوبہ ۳۶:۱۳، الرعد ۳۸)۔

الکتاب کا لفظ قرآن مجید کے لئے، عموماً کسی آسمانی کتاب کے لئے، بحیثیت مجموعی تمام سابقہ وحیوں کے لئے (۱۳، الرعد ۴۳)، غرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام نازل شدہ کتب کے لئے اختیار کیا گیا ہے، (۲، البقرہ ۲۱۳-۳-۱۸۴)، (دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳، صفحہ ۵۹۳)۔

اس اعتبار سے اہل کتاب سے اصطلاحاً مراد ہے کسی الہامی اور آسمانی کتاب کے ماننے والے لوگ، یعنی اہل مذاہب اور اہل ادیان، خصوصاً توراۃ وانجیل کے ماننے والے، بالفاظ دیگر نزول قرآن سے پہلے کے وہ لوگ جن کا کسی آسمانی کتاب پر ایمان ہو مثلاً یہود جو تورات پر ایمان رکھتے ہیں اور نصاریٰ جو انجیل پر ایمان رکھتے ہیں، ایسے لوگ اہل کتاب کہلاتے ہیں۔ البتہ اس دنیا میں بعض ایسی قومیں بھی ہیں جن سے بعض فقہاء احناف نے اہل کتاب کا معاملہ کیا ہے اور بعض نے مشرکین کا، یہ اختلاف رائے اس پر مبنی ہے کہ بعض کے نزدیک ان کا اہل کتاب ہونا محقق تھا اور بعض کے نزدیک نہیں۔ (مستفاد قاموس الفقہ، جلد ۱، صفحہ ۲۵۵)

کیا عصرِ حاضر کے یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں؟

قرآن مجید میں اہل کتاب کو مشرکین سے الگ گروہ قرار دیا گیا ہے، جیسے فرمایا: مایود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین (البقرہ:۱۰۵) اور کبھی امیین کے ساتھ ان کا ذکر کر کے انھیں ایک گروہ قرار دیا ہے، جیسے فرمایا: وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین (آل عمران:۲۰)۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے اہل کتاب کا شمار

کن میں ہوگا؟ استاذ گرامی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

''یہاں اس بات کی وضاحت کر دینی مناسب ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو عیسائی ہیں اور جو حضرت مسیح یا حضرت مریم وغیرہ کی پرستش کرتے ہیں وہ بھی اہل کتاب میں داخل ہیں اور ان کو عام مشرکین کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا، اس لئے کہ اسلام نے اس زمانہ میں بھی نکاح وذبیحہ وغیرہ کے معاملے میں اہل کتاب کے ساتھ بعض خصوصی مراعات رکھی ہیں، جب وہ عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو خدا مانتے تھے۔ البتہ ہمارے زمانے میں عیسائیوں اور یہودیوں کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ ہے جو محض نام کا عیسائی ہے، ورنہ درحقیقت وہ خدا کے وجود، نبوت، وحی و الہام، حشر ونشر وغیرہ کا منکر ہے، ایسے لوگ درحقیقت یہودی، عیسائی اور اہل کتاب نہیں ہیں، اور نہ اس نوعیت کے دہریہ اور کمیونسٹ نام نہاد مسلمان، صحیح مسلمان ہیں، ان کے احکام عام کافروں کے ہیں، اہل کتاب کے نہیں''۔

اہل کتاب سے متعلق بعض اور تفصیلات:

اہل کتاب کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ ان کے مذاہب اپنی اپنی جگہ سچے تھے اور ان کے نبی اپنی قوم کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے، اور کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ تمام انبیاء پر ایمان نہ لائے۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن کے نام قرآن مجید میں مذکور ہیں (اور ان پر نام بنام ایمان لانا ضروری ہے) اور وہ بھی جن کے نام مذکور نہیں، ان کی صداقت پر مجملا ایمان لانا ضروری ہے۔ کل آمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ (بقرہ:۲۸۵) اس طرح ہر مسلمان تمام انبیاء کا مصدق اور ان کے من جانب اللہ ہونے مانتا ہے (المائدہ: ۴۸)، لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ اب ان کی کتابیں محرف ومبدل اور منسوخ ہو چکی ہیں۔ (روح المعانی ۱/ ۲۹۸)

الغرض اہل کتاب سے اولاً مراد یہود ونصاریٰ ہیں، بعض اہل علم نے صابی اور مجوس کو بھی اہل کتاب میں شامل کیا ہے، اور بعض نے ان کو شبہ اہل کتاب کہا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اہل کتاب کی اصطلاح دور مکی کے اختتام سے پہلے قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوتی، لیکن یہ درست نہیں، دورِ مکی کی سورۃ العنکبوت میں یہ اصطلاح موجود ہے۔

صائبین سے مراد کون لوگ ہیں؟ کیا یہ اہل کتاب ہیں؟

یہود ونصاریٰ اور صائبین کا ذکر قرآن مجید نے اہل کتاب کی حیثیت سے کیا ہے، یہود ونصاریٰ اہل کتاب ہیں، یہ تو معروف ومشہور ہے لیکن کیا صائبین بھی اہل کتاب میں ہیں، اس سلسلے میں اہل علم اور اصحابِ تحقیق نیز مفسرین کے مابین اختلاف ہے۔

مشہور محدث اسحاق بن راہویہؒ صائبین سے متعلق کہتے ہیں فرقۃ من اھل الکتاب (ابن کثیر) یہ اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے، صابیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں (ابن کثیر)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ صائبین کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن مجید نے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ صابیوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص مذہب کے حاملین و معتقدین تھے

(بقرہ:۶۲)، اور سلفِ صالحین کے اقوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے آنے کے بعد بھی ایک ڈیڑھ سو سال یہ مذہب پایا جاتا تھا اور مختلف علاقوں میں شاید الگ الگ ٹکڑیوں میں اس کے ماننے والے آباد تھے اور ان میں خاصا اعتقادی اختلاف بھی پایا جاتا تھا، خلیلؒ کا خیال ہے کہ ان کا مذہب عیسائیت سے قریب تھا، یہ جنوب کو اپنا قبلہ بناتے تھے اور اپنے کو حضرت نوحؑ کے دین پر تصور کرتے تھے''۔ (قاموس الفقہ جلد۴ صفحہ ۲۱۵)

مفسرین کی تحقیق صائبین کے بارے میں:

صائبون یا صائبہ کے نام سے آج کل کوئی قوم معروف ومشہور نہیں، اس لئے اس کی تعیین میں علماء وائمہ کے اقوال مختلف ہیں، امام تفسیر ابن کثیر نے بحوالہ قتادہؒ ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ صائبون وہ لوگ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور قبلہ کے خلاف نماز پڑھتے ہیں، اور آسمانی کتاب زبور کی تلاوت کرتے ہیں (جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی) قرآن مجید کے اس سیاق سے بظاہر اس کی تائید ہوتی ہے کہ چار آسمانی کتابیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔ اس میں ان چار کتابوں کے ماننے والوں کا ذکر آ گیا ہے۔ (مستفاد معارف القرآن جلد سوم صفحہ ۱۹۹)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صائبین کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الصائبون- صابی کے لفظی معنی ہیں جو کوئی بھی اپنے دن کو چھوڑ کر دوسرے دین میں آجائے یا اس کی طرف مائل ہوجائے۔ "صابی ابو اسحق الزجاج الصائبون المخارجون من دین إلی دین" (تاج)" قیل لکل خارج من الدین إلی دین آخر صابی" خود رسول اللہ ﷺ کو شروع میں صابی اس لئے کہا جانے لگا کہ آپؐ نے دین قریش کو چھوڑ کر دین اسلام اختیار کیا ہے، "وکانت العرب سمی النبی ﷺ الصابی لأنه خرج من دین قریش إلی دین الاسلام" اصطلاح میں صابیون (Sabians کے نام کا ایک مذہبی فرقہ جو عرب کے شمال و مشرق میں شام وعراق کی سرحد پر آباد تھا یہ لوگ دین توحید اور عقیدہ رسالت کے قائل تھے، اور اس لئے اصلا اہل کتاب تھے، انہیں کو ''نصارائے یحییٰ'' بھی کہا جاتا تھا گو یہ نسبت ایک پیغمبر حضرت یحییٰ کی جانب رکھتے تھے، حضرت عمرؓ جیسے مبصر ونکتہ رس خلیفۂ راشد اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے محقق صحابی نے صابیون کا شمار اہل الکتاب میں کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے ان کا ذبیحہ بھی حلال مانا ہے، "قال عمر بن الخطاب وابن عباس هو قوم من اهل الكتاب وقال عمر تحل ذبائحهم مثل ذبائح اهل الكتاب" (معالم) اور اہل لغت بھی اس طرف گئے ہیں هم جنس من اهل الكتاب (صحاح جوہری) (تفسیر ماجدی جلد ا صفحہ ۱۵۱)

علامہ طبریؒ صائبین کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والصائبون جمع صابی، وهو المستحدث سوی دینه دینا کالمرتد من أهل الاسلام عن دینه، وکل من خرج من دین إلی آخر یسمیٰ صائبا۔ (التفسیر المنیر جلد ا، صفحہ ۱۷۷)

علامہ قرطبیؒ تحریر فرماتے ہیں: "والصائبین" جمع صابی، وقیل صاب، ولذلك اختلفوا فی همزه، وهمزه الجمهور إلا نافعا، ضمن همزه جعله من صبأت النجوم إذا طلعت وصبأت ثنية الغلام إذا خرجت ومن لم يهمز جعله من صبا يصبو إذا

مـال، فـالصابى فى اللغة: من خرج ومال من دين إلـى ديـن، ولهذا كانت العرب تقول لمن أسلم قد صبـا، فـالـصـابـئـون قد خرجوا من دين اهل الكتاب، آگے مزید تحریر فرماتے ہیں:

لا خـلاف فـي أن اليهـود والـنـصـارىٰ أهل الـكتـاب ولأجـل كتـابهم جاز نكاح نسائهم واكل طـعامهم وعلى ما يأتى بيانه فى المائدة، وضرب الجزية عليهم، على ما يأتى فى سورة "براء ة" إن شـاء الـلـه، واختلف فى الصائبين، فقال السدى: هـم فرقة من اهل الكتاب، قاله اسحق بن راهويه: قـال ابـن الـمـنـذر وقـال اسـحق لا بأس بذبائح الصائبين لأنهم طائفة من اهل الكتاب، وقال ابو حـنيـفـه: لا بـأس بـذبـائحهم ومناكحه نساء هم، وقـال الخليل، هم من يشبه دينهم دين النصارىٰ، إلا أن قبـلتهـم نـحو مهب الجنوب، يزعمون أنهم عـلـى ديـن نـوح عـليهـم الـسلام وقـال مجـاهد والـحـسـن وابـن ابـى نجيح هو قوم تركب دينهم بيـن اليهودية والمجوسية لا توكل ذبائحهم، ابن عبـاس ولا تـنـكـح نسـاء هـم وقـال الحسن ايضا وقتـادـة هـم قـوم يعبدون الملائكة ويصلون إلى الـقبلة ويقروؤن الزبور ويصلون الخمس۔(الجامع الاحکام القرآن جلد اصفحہ۲۹۵)

ان تمام تفصیلات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صائبین دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو یقیناً ابتداء میں کسی دین کے پیرو رہے ہوں گے، اسی لئے قرآن میں یہودیت وعیسائیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بعد میں وہ اپنے اصل مذہب سے بالکل الگ ہوگئے اور ان کے اندر فرشتہ پرستی اور ستارہ پرستی آگئی، یا یہ کسی بھی دین کے پیرو نہ رہے اس لئے لا مذہب لوگوں کو صابی کہا جانے لگا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ اس دور میں اس نام سے کوئی قوم معروف ومتعارف نہیں ہے، لیکن صائبین کے بارے میں فقہاء کی احتیاط سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ کوئی بھی گروہ جس کا اہل کتاب ہونا مشکوک ہو تو جب تک اس کا اہل کتاب میں ہونا تحقیق نہ ہوجائے، ذبیحہ اور عورتوں کی حلت کے باب میں ان کو اہل کتاب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا''(قاموس الفقہ جلد۴)

صـائبیـن کـی ایک عجیب وغـریـب تحقیق جو کہ محلِ نظر ہے:

ماضی قریب کے ایک عالم مولانا شمس نوید عثمانیؒ تھے جن کی کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' عوام وخواص میں بہت مشہور ومقبول ہوئی لیکن علماء اور اصحابِ تحقیق کی نظر میں یہ کتاب مشکوک، مختلف فیہ اور محل نظر ہے لیکن یہ اعتراف بھی کہ یہ کتاب بہت محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ہندوؤں کو قوم نوح اور پھر حضرت نوح کی قوم کو صائبین (نتیجتاً ہندوؤں کو صائبین) کا مصداق قرار دیا ہے، اور اس کے لئے جو دلائل پیش کئے ہیں ان سے فرق ضالہ (مثلاً، قادیانی اور غالی شیعہ فرقوں) کے استدلالات بھی مانند نظر آتے ہیں اور ان استدلالات کی نوعیت (حضرت الاستاذ مولانا برہان الدین سنبھلی کی تحقیق کے مطابق) محض نکتہ آرینی کی یا اعتبار و تاویل کی نہیں، بلکہ صریحاً تحریف معنوی یا کم از کم تفسیر بالرأی کی ہے، جس کی مذمت احادیث صحیحہ میں صراحت سے کی گئی ہے مثلاً مصنف نے اس کتاب میں قوم نوح کو ''صائبین''

ثابت کرنے کے لئے اس طرح کا استدلال بھی کیا ہے کہ قرآن مجید میں حضرت محمد ﷺ، حضرت عیسی علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے، ان رسولوں میں سے ہر ایک کی طرف ایک ایک امت منسوب ہے مگر حضرت نوحؑ کی طرف کوئی امت منسوب نہیں، حالانکہ صائبین کا ذکر قرآنِ مجید میں ہے، لہذا اس سے یہ نکلا کہ صائبین حضرت نوح کی قوم ہے، (ملخص اگر اب بھی نہ جاگے تو صفحہ ۴۰)۔

حالاں کہ بالعموم انبیاء مذکورین کے ساتھ متصلا نصاریٰ و صائبین وغیرہ کا ذکر نہیں، بلکہ الگ مستقل طور پر ہے، اس لئے یہ استدلال بے معنی ولغو ہے، نیز یہ کہ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ ایسے بہت سے انبیاء کا ذکر ہے کہ جن کی طرف کوئی امت منسوب نہیں ہے، مثلا حضرت ایوب علیہ السلام۔ (مستفاد متاع علم وفکر صفحہ ۳۷۸)

عصرِ حاضر کے وہ اہل کتاب جو خدا کے وجود کے قائل نہ ہوں ان کا حکم:

عہد حاضر کے وہ یہود ونصاریٰ جو محض نام کے یہودی اور عیسائی ہیں اور جو خدا کے وجود، نبوت، وحی والہام، حشر ونشر وغیرہ کے منکر ہیں، ایسے لوگ درحقیقت یہودی عیسائی اور اہل کتاب نہیں ہیں بلکہ اس نوعیت کے دہریہ اور کمیونسٹ نام نہاد مسلمان بھی مسلمان نہیں ہیں اس لئے ایسے لوگوں کے احکام عام کافروں کے ہوں گے، اہل کتاب اور مسلمان کے نہیں۔ ان کے ساتھ نکاح اور ذبیحہ میں اہل کتاب جیسا معاملہ نہیں ہوگا۔

فقیہ عصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک استفتا کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

جو لوگ نام کے عیسائی اور یہودی ہوں، لیکن عقیدہ کے اعتبار سے خدا کے وجود نبوت ووحی اور ملائکہ وغیرہ کے قائل نہ ہوں، وہ ملحد ہیں، ان کا شمار اہل کتاب میں نہیں، گو خاندانی نسبت کی بنا پر وہ یہودی یا نصرانی کہلاتے ہوں، جو لوگ مذہبی اعتبار سے واقعی یہودی یا عیسائی ہوں، گو حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا ٹھہراتے ہوں، لیکن عفت وعصمت اور پاک دامنی کا ان کے یہاں لحاظ نہ ہو، تو ایسی عورتوں سے کسی مسلمان مرد کا نکاح کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ قرآن میں پاک دامن کتابیہ سے نکاح کی اجازت دی ہے، جو لوگ واقعی اہل کتاب ہوں اور ان کی عورتوں کے بارے میں پاکدامن ہونے کا گمان ہو، لیکن وہ مسلمانوں کا ملک نہ ہو، بلکہ غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو تو، ایسی جگہ کتابیہ عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح مکروہ تحریمی ہے "یکرہ تزوج نساء اھل الحرف من الکتابیات" موجودہ حالت میں مسلم ملکوں میں بھی ایسی عورتوں سے نکاح کرنا کراہت سے خالی نہیں، علامہ شامیؒ نے ان سے نکاح کو مکروہِ تنزیہی قرار دیا ہے "فیہ کراھۃ التنزیہ فی غیر الحربیۃ" علامہ شامیؒ نے یہ بات اپنے عہد کے لحاظ سے فرمائی ہے، موجودہ دور میں عرب حکمرانوں اور اعلیٰ عہدیداروں کی زوجیت میں یہودی اور عیسائی خواتین کے رہنے نے ایسے فتنے پیدا کئے ہیں اور عالم اسلام کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہونچایا ہے کہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مغربی تہذیب کے اس دور میں مسلم ملکوں میں کتابیہ عورتوں سے نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ اعلم (کتاب الفتاویٰ جلد ۴، صفحہ ۵۵-۳۵۴)۔ (.....جاری)

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

آزادی اور اسلام

نعمان بدر فلاحی

آزادی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ، بنیادی حق اور ایک مقدس صورتحال کا نام ہے۔ اللہ نے بنی نوع انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے اُن میں ایک اہم نعمت آزادی ہے۔ خالق کائنات نے اپنی مخلوقات میں نباتات و جمادات کے برخلاف حیوانات کی فطرت اور سرشت میں حریت پسندی کو داخل کر رکھا ہے۔ چنانچہ اشرف المخلوقات حضرت انسان ابتدائے آفرینش سے ہی آزادی کے متوالے اور اس کے خواہاں رہے ہیں۔ قدرت نے انسان کو جو بے پناہ فطری قوتیں نیز اوصاف وخصوصیات عطا کی ہیں وہ صرف آزادی کی صورت میں بروئے کار آسکتی ہیں۔ آزاد فضا میں ذہن کے بند دریچے کھلتے ہیں اور انسان کی علمی، فکری اور تحقیقی سطح بہت بلند ہوجاتی ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ جہاں انسان کو اپنی فطری آزادی کے ساتھ کام کے مواقع میسر آئے وہاں انسانیت کا چمن لہلہا اُٹھا۔ خوشحالی اور پرسکون زندگی کی عمارت بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ انسانیت کو عروج، اقبال اور ترقی کی معراج نصیب ہوئی۔

لیکن اس کے برخلاف غلامی میں فکر ونظر محدود، ذہن ودماغ کی قوتیں مفلوج اور ذہنی صلاحیتیں جمود وتعطل کا شکار ہوجاتی ہیں۔ جب اور جہاں انسانوں کو غلام بنایا گیا وہاں زندگی کی خوشیاں آہوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ہنستے مسکراتے اور شاداب چہروں پر نحوست، بے رونقی اور محرومیوں کی سیاہی چھا گئی۔ فطری صلاحیتوں نے دم توڑ دیا اور انتہائی قیمتی ہیرے جواہرات بے مول ٹھیکروں کے مانند یونہی زمین میں دفن ہوگئے۔

اسی نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

آزادی کا مفہوم :

عربی زبان میں آزادی کو 'حریت' جبکہ انگریزی میں Freedom یا Liberty کہتے ہیں۔ فقہاء نے اس کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے ''حریت پورے ارادہ واختیار کے ساتھ تصرف پر قدرت نیز آدمی کا غلامی کی قید سے خالی ہونے کا نام ہے۔ (معجم لغۃ الفقہاء)۔

آزادی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص یا ایک قوم خدا کی بندگی کرنے کے لیے آزاد ہو۔ یعنی مخلوق سے آزاد ہوکر خالق کا غلام بن جانا ہی آزادی ہے۔ انسانوں پر خودساختہ انسانی قوانین کو بالجبر مسلط نہ کیا جائے۔ انسان سماج کی بے جا رسوم ورواج کا پابند اور اس کے بندھنوں میں جکڑا ہوا نہ ہو۔ ہر انسان کو اپنی انفرادی، معاشرتی، مذہبی اور معاشی زندگی کا تحفظ حاصل ہو۔ اسے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے اور حصول انصاف کا بھی پورا حق حاصل ہو۔

آزادی یا(Freedom)اس حالت وکیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان کو بنیادی حقوق مثلاً عقیدے اور مذہب پر عمل کا اختیار، عبادت گاہوں کی تعمیر اور ان کی مرمت کا اختیار، عزت و ناموس کے تحفظ کا اختیار، مالکانہ حقوق واختیارات، تنظیم سازی کا اختیار، تہوار اور جلسے جلوس کا اختیار، تعلیم گاہوں کے قیام کا اختیار، ریسرچ وتحقیق کا اختیار، تہذیب وشائستگی کے دائرے میں زبان وقلم نیز پریس اور میڈیا کے استعمال کا اختیار، اظہار رائے کا اختیار (جو دوسروں کی ایذا رسانی کا باعث نہ ہو) تنقید ومحاسبہ کا اختیار، کاروبار اور ملازمت کا اختیار، غذا اور خوراک کا اختیار، لباس اور پوشاک کا اختیار، تبدیلیٔ مذہب کا اختیار، اور تہذیبی تشخص کو برقرار رکھنے کا مکمل اختیار حاصل ہو۔

آزادی یہ ہے کہ کسی کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی سے روکا نہ جائے۔ انسان کو اپنے معاملات میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا اختیار ہو۔ اپنے پسندیدہ نظریے، عقیدے اور فکر کو اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ہر انسان کے پاس خود ارادیت کا حق (Right of Self Ditermination) ہو۔ جس انسان کو خالق کائنات نے فکر و عمل کی آزادی کا اختیار دے کر دنیا میں بھیجا' اس کو غلام بنالینا دراصل خالق کائنات کی توہین اور اس کے فطری نظام کے خلاف بغاوت ہے۔

بدقسمتی سے مغرب میں آزادی کے تصور نے تمام حدود و قیود کو پار کرلیا ہے۔ وہاں آزادی کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ انسان مذہب اور اخلاق سے بالکل آزاد ہوجائے۔ آزادی کے نام پر بے حیائی اور عریانیت کو فروغ دیا گیا، سود وقمار کی اجازت دی گئی، شراب کی حوصلہ افزائی کی گئی اور جنسی تلذذ کی تمام امکانی صورتوں کو سند جواز دے دی گئی۔ یعنی انسان نے ایسی آزادی حاصل کی کہ وہ مذہب واخلاق کے تمام اصولوں، قدروں اور قدیم سماجی روایات سے آزاد ہوکر نفس کا بدترین غلام بن گیا۔ آزادی کا بالکل بے قید ہوجانا بھی انسانیت کے لیے زبردست فساد اور مضرت کا سبب ہے۔

مغرب کا تصور آزادی :

صدیوں پوپ اور کلیسا کے جبر وتشدد کے سائے میں گُھٹ گُھٹ کر جینے کے بعد جب ۱۸ ویں صدی عیسوی میں یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوا تو ردعمل کے نتیجے میں آزادی کا ایک بے حیا، فحش، دوغلا، خود غرضانہ اور غیر فطری نظریہ پروان چڑھا جس نے مذہبی روایات اور انسانی اقدار کا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔ آج مغرب میں عورتوں کو برہنہ رہنے اور ہونے کی مکمل آزادی ہے مگر باحجاب طالبات کو کالج سے نکال دیا جاتا ہے اور عوامی مقامات پر پردے کے شرعی حکم پر عمل ایک جرم ہے۔ امریکہ جیسے مہذب، ترقی یافتہ، حقوق انسانی اور آزادی کے سب سے بڑے علم بردار ملک میں آج بھی سیاہ فام خود کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتے ہیں اور اپنے حقوق کے لیے انجمنیں بنا کر باضابطہ جدوجہد کررہے ہیں۔ اس کے بالمقابل ۱۴ سو سال قبل رسول اللہ ﷺ نے صرف یہ اعلان ہی نہیں کیا کہ ''کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر'' بلکہ سیاہ فام بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو بیت اللہ اور مسجد نبوی کا مؤذن بنا کر اتنا اونچا مقام عطا فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں سیدنا بلال کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

مغرب کی فحش آزادی نے معروف اخلاقی قدروں کا گویا خاتمہ ہی کردیا ہے۔ متعدد ممالک میں ہم جنسی یعنی Homo Sexuality کو پارلیمنٹ میں بل پاس کرکے قانونی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بیٹا اپنی ماں کے ساتھ، بھائی بہن کے ساتھ اور انسان جانوروں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں حکومت برطانیہ نے ہم جنسی کے مسئلے پر غور وفکر کے لیے Wolfenaden Committee بنائی تھی جس نے اپنی رپورٹ میں لکھا: ''اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اچھی بات

نہیں ہے بلکہ ایک برائی ہے،لیکن اس معاشرے میں جہاں ہر فرد کو آزادی دینے کا اعلان کیا گیا ہے ہمارے پاس کوئی ایسی وجہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم اِس کی مخالفت کریں۔ہمارے چارٹر میں یہ بات داخل ہے کہ ہم ہر انسان کو اس کی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی اجازت دیں،لہٰذا اس وجہ سے ہم اس کی تائید کرنے پر مجبور ہیں''۔

برطانیہ کے ڈاکٹر فریڈ مین کا خیال بھی ملاحظہ فرمائیے :

''درحقیقت عقل کوئی چیز نہیں،اصل چیز خواہشات ہیں اور اس پر کوئی روک نہیں لگائی جاسکتی۔اس دنیا میں اچھی اور بری چیزوں کا کوئی تصور نہیں۔بس اچھی چیز وہ ہے جسے انسان کی خواہش تسلیم کرے اور بری چیز وہ ہے جسے انسان کی خواہش برا سمجھے'' (قانون معیشت اسلام کی روشنی میں،تقی عثمانی)۔

اظہار رائے کی آزادی(Freedom of Expression) کے نام پر دنیا بھر کے ڈیڑھ بلین (۱۵۰ کروڑ) سے زیادہ مسلمانوں کے جذبات کو نظر انداز کر کے آج مغرب میں پیغمبر اسلام اور محسن انسانیت ﷺ کی شان میں کارٹون اور فلم بنا کر اور مضامین لکھ کر گستاخیاں جائز سمجھی جاتی ہیں مگر ۱۰ ملین یہودیوں کے جذبات کی رعایت میں اسپین ، آسٹریلیا، اسرائیل ، جرمنی ، بلجیم ، ہنگری، رومانیہ اور فرانس وغیرہ میں ہولوکاسٹ کے خلاف بولنا ،لکھنا ، یا اس پر شبہ ظاہر کرنا قابل تعزیر جرم ہے ۔ برطانیہ جیسے ملک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں تو گستاخی جرم ہے مگر پیغمبر اسلام محمد عربی ﷺ کے خلاف سلمان رشدی جیسے لوگوں کو دریدہ دہنی کی پوری اجازت ہے۔

علامہ یوسف القرضاوی نے اسلام اور مغرب کی آزادی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

''وہ آزادیاں جن کا اسلام نہ صرف قائل بلکہ محافظ ہے' حقوق و مصالح کی آزادیاں ہیں ، کفر و معصیت کی نہیں۔یہ وہ آزادیاں نہیں ہیں جن کا اہل مغرب دم بھرتے ہیں اور جن کو شخصی آزادی یا پرائیویٹ لائف سے تعبیر کرتے ہیں کہ انسان شخصی طور پر مکمل آزاد ہے۔ چاہے زنا کرے ،شراب پیے یا کوئی اور گناہ کا کام کرے۔اسلام اِس کفر و فسق کی آزادی کا قائل نہیں ہے، بلکہ اسلام حقوق و مصالح کی آزادی کا قائل ہے جیسا کہ میں نے اوپر واضح کیا ۔ اسلام اس آزادی کا قائل نہیں ہے جس میں اپنا یا دوسروں کا نقصان پوشیدہ ہو یا جو آزادی تباہی و ہلاکت کی طرف لے جاتی ہو۔آپ کی آزادیاں وہاں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے دوسروں کا نقصان شروع ہوتا ہے۔آپ کو سڑک پر کار چلانے کی مکمل آزادی حاصل ہے لیکن اس آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ایکسیڈنٹ کرتے پھریں۔آپ کو ٹریفک کے قوانین کی پابندی ہر حالت میں کرنی ہے'' (ترجمہ فتاویٰ یوسف القرضاوی، ص ۳۳۸)

اسلام فطرت کے خلاف ایسی مطلق آزادی کو تسلیم نہیں کرتا جو شتر بے مہار، مادر پدر آزاد اور کسی نظام و قانون کی پابند نہ ہو، بلکہ اسلام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اصول، ضابطے اور آداب و قوانین کی لگام پہناتا ہے تاکہ سماج میں بدامنی اور شر و فساد کو پھیلنے سے روکا جاسکے۔ پابندیوں کی زمین پر ہی آزادی کی کونپل پھوٹتی ہے۔شاید اقبال نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ع

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے آزادی کے ضمن میں لکھا ہے کہ ''مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعی ہے، اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد اس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اُس کے رب نے اسے دیا ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول و قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے، اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملے میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول

کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اسی صورت میں آزادئ عمل برتتا ہے۔ اس کی آزادئ عمل اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملے میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادئ عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے''۔ (تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۳۶۵)۔

حقیقی آزادی تو بلاشبہ اللہ واحد کی بندگی اور غلامی میں ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ انسانی آزادی کا ڈھول پیٹنے والے ادیان باطلہ ہوں یا جدید مادہ پرستانہ مغربی افکار ونظریات' سب کے سب انسانوں کا استحصال کررہے ہیں اور انہیں متعدد مختلف النوع اشیاء اور لذت کام ودہن کا غلام بناتے چلے جارہے ہیں۔

عصر حاضر میں انسانی آزادی کی صورت حال : آج عالمی سطح پر اقوام متحدہ (United Nation) کے تحت آزادی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے مختلف تنظیمیں اور ادارے سرگرم ہیں مگر حقیقی آزادی کی یہ جنس کم یاب ہے۔ بلند بانگ دعووں کے باوجود انسانیت حقیقی آزادی کے لیے ترس رہی ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں اور ممالک میں کتنی ہی قومیں ہیں جو اِس ترقی یافتہ جدید دور میں بھی غلامی کے شکنجے میں کسی ہوئی ہیں۔ متعدد ممالک، ریاستیں اور خطے جارح استعماری قوتوں کے خلاف سیاسی آزادی کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایسے ملک بھی ہیں جو بظاہر سیاسی طور پر آزاد ہیں مگر اقتصادی، تہذیبی اور تمدنی غلامی کا شکار ہیں۔

ہندوستان جسے بلاشبہ اگست ۱۹۴۷ء میں بیش بہا قربانیوں اور جاں گسل جدوجہد کے بعد برطانوی استعمار کے پنجوں سے سیاسی آزادی حاصل ہوئی، مگر آج ۷۲ برس کے بعد بھی ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اکثریتی طبقے نے آزادی سے محروم کررکھا ہے۔ عیسائیوں، دلتوں، سکھوں اور مسلمانوں پر اس عرصے میں جو کچھ گزری ہے اسے بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ سیکولر جمہوری اسٹیٹ میں جان و مال، عزت وآبرو، عبادت خانے اور تعلیم گاہوں کے تحفظ کو آج تک یقینی نہیں بنایا جاسکا۔ گورے آقاؤں کی جگہ سیاہ فام آریائی نسل کے برہمن حکمرانوں نے آزادی کے سبز باغ ضرور دکھائے مگر ہزاروں برسوں سے شودروں کو غلام بنا کر رکھنے والوں کی ذہنیت اور فکر ونظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ مختلف علاقوں میں چھوٹی ذات کا دولہا اپنی شادی کے موقع پر بھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوسکتا اس لیے کہ یہ حق تو صرف اعلیٰ ذات والوں کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی قیادت میں بدھ مت قبول کرنے والے لاکھوں انسان بہرحال آزادی اور انصاف سے محروم رہ گئے۔ طبقاتی نظام اور ورن ویوستھا کے ظلم وستم کے نتیجے میں بدترین سماجی غلامی سے آزادی اور نجات تو صرف اسلام کے سایۂ رحمت میں ہی میسر آسکتی ہے۔

بھارت ہی نہیں' دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ اور انسانی حقوق کی صدائیں بلند کرنے والے ممالک میں خواہ امریکہ، روس اور چین ہوں یا عرب اور افریقہ کی مسلمان ریاستیں' انسانی آزادی کی صورتحال تقریباً یکساں ہے۔ وہ مسلم ممالک جہاں ملوکیت یا آمریت کا دور دورہ ہے، اگر انسانی حقوق سلب کرنے میں وہ کمیونسٹ ممالک سے آگے نہ ہوں تو غالباً پیچھے بھی نہیں ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان کے ۲ شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اُن کی نسلوں کو تباہ کرنے والا امریکہ بہادر آج بھی عراق، شام اور افغانستان میں انسانوں کو غلام بنا کر اُن کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوق انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئے ہیں' نصف صدی پہلے تک انہوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نوآبادی بنائے ہوئے ہیں۔ ۳۰/نومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں

ایک قرارداد منظور کی تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنیے کہ اُن چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھے۔ یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھیکیدار!!!

یورپ کے مشہور مفکر روسو کا ۱۷۵۰ء میں کیا گیا یہ شکوہ ''انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن آج وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے'' صدیوں بعد آج بھی حرف بہ حرف درست معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے جب انسان شرک کی تاریک وادیوں میں بھٹکتا ہے تو اسے تہہ در تہہ غلامی کی زنجیریں جکڑ لیتی ہیں۔ وہ صرف خواہشات، آبائی رسوم و رواج اور سماجی روایات کا غلام نہیں ہوتا بلکہ اپنے جیسے انسانوں کو 'بھاگیہ وان' سمجھ کر اُن کی غلامی کا طوق بھی اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ غلامی محض قید و بند کو نہیں کہتے کیونکہ یہ تو غلامی کی ایک سہل ترین قسم ہے جو دیر سویر جاتی رہتی ہے، غلامی تو دراصل اس عادت کی ہوتی ہے جو جڑ پکڑ لے یا اس لذت اور شہوت کی ہوتی ہے جو سر پر سوار ہو جائے اور جس سے کنارہ کشی ممکن نہ ہو۔ لہٰذا مطلوب اور حقیقی آزادی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی خواہشات اور منفی جذبات پر قابو رکھتا ہو اور کوئی عادت، رجحان اور تمنا اسے اپنا اسیر نہ بنا سکے۔

انسانی آزادی کا دشمن کون؟

❁ انسانی آزادی کا سب سے بڑا دشمن ہمارے اندر پوشیدہ ہمارا نفس ہے۔ انسان کا پیٹ، اس کی بھوک، جنسی خواہشات، عیش و آرام کی آرزو، معیار زندگی بلند کرنے کی تمنا جب حد اعتدال سے بڑھ جائے تو انسان غلامی سے قریب ہو جاتا ہے۔

❁ توحید کا انکار غلامی کا ایک اہم ترین بنیادی سبب ہے۔ جب انسان اپنے رب اور مالک حقیقی کی اطاعت و فرمانبرداری سے منہ موڑ کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرتا ہے تو دنیا کی ہر شے اسے اپنا غلام بنا لیتی ہے۔ گویا شرک غلامی کی ایک اہم ترین وجہ ہے۔ جب انسان اپنے خالق کو چھوڑ کر جانوروں، کیڑے مکوڑں، پیڑ پودوں، سورج، چاند، ستاروں، آگ اور ہوا وغیرہ کی پوجا کرنے لگے تو وہ اپنی آزادی کو نیلام کر دیتا ہے۔ الٰہ واحد کی غلامی کے سوا تمام قسم کی غلامیاں باطل ہیں۔ آزادی کے حصول، انسانی مجد و شرف کی بحالی نیز شرک و بت پرستی کے سبب پستی کے قعر مذلت میں ڈوبے ہوئے انسانوں کی نجات کے لیے اُن تمام غلامیوں کے خلاف منظّم تحریک لازمی ہے۔ شاعر مشرق نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ع

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

❁ سرمایہ دارانہ نظام بھی انسانی آزادی کا بہت بڑا دشمن ہے۔ IMF اور ورلڈ بینک وغیرہ کے ذریعہ عالمی طاغوت نے تیسری دنیا کے کروڑوں انسانوں کو اور ۱۰۰ سے زیادہ پسماندہ ممالک کو عملاً اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ دراصل ورلڈ بینک ایک یہودی ادارہ ہے جس کے ذریعہ یہود پوری دنیا کے معاشی نظام کو اپنی مٹھی میں رکھتے ہیں۔ اقتصادی طور پر بدحال ممالک کو خود آگے بڑھ کر قرضے فراہم کرتے ہیں اور مستقل سود وصول کرنے کے علاوہ اپنے پروگرام اور پالیسیاں زبردستی اُن پر تھوپتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہیں بلیک میل کیا جاتا ہے۔

❁ مغرب کا فاسد استعماری فلسفہ جس نے ماضی قریب میں بیشتر ایشیائی ممالک کو طویل مدت تک باج گزار اور کالونی بنا رکھا تھا 'انسانی آزادی کو سلب کرنے کا ایک بدترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ اسی فلسفے کو اختیار کر کے درندگی کی علامت صہیونی مقتدرہ فلسطین میں گذشتہ ۷۵ برسوں سے انسانی آزادی کو بے دردی کے ساتھ مسخ کرنے میں مصروف ہے۔

❁ اقوام متحدہ (United Nation) کی سرپرستی میں ویٹو پاور کی حامل ۵ بڑی طاقتیں امریکہ، روس، چین برطانیہ اور فرانس وغیرہ دراصل عدل و انصاف، مساوات اور انسانی آزادی کی عملاً دشمن ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری دنیا اِن پانچ

خداؤں کی جاگیر ہے (نعوذ باللہ)۔ان کے جارحیت پسندانہ عزائم اور ظالمانہ اقدامات کے سبب دنیا بھر کے کمزور، غریب اور پس ماندہ ممالک اور بالخصوص امت مسلمہ ایک طویل عرصہ سے دہشت زدہ ہیں۔

❁ غیر منطقی آبائی رسوم و رواج، جاہلی سماجی روایات اور مذہبی اوہام وخرافات کی اندھی تقلید بھی انسانی آزادی کی دشمن ہے جس سے چھٹکارا صرف عوام الناس کے تعلیمی معیار کو بلند کر کے اور Scientific Aproach کے ذریعہ دلایا جاسکتا ہے۔

❁ دین بے زار سیاست اندھی، لنگڑی اور ہمیشہ سے ہی انسانی آزادی کی سخت ترین دشمن رہی ہے۔تاریخ کے مستند واقعات گواہی دیتے ہیں کہ سیاست جب بھی الٰہی تعلیمات، علم و اخلاق، مساوات اور تکریم انسانیت کے اصولوں سے بے زار ہو کر کبر و غرور، سفلی خواہشات اور مادی مفادات کی غلام ہوئی، انسانوں کی آزادی سلب کر لی گئی۔قرآن مجید میں فرعون کی جس سیاست کا متعدد مقامات پر تذکرہ ہے وہ اسی قبیل کی ہے۔اقبالؒ نے اسی لیے کہا تھا ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

❁ جبری تسلط کے ذریعہ قائم ہونے والی خاندانی، فوجی یا آمرانہ حکومتیں بالعموم فطری آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کو بے دردی کے ساتھ پامال کرتی ہیں۔موجودہ زمانے میں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین، مصر اور شام وغیرہ اس کی زندہ مثال ہیں جہاں حکمرانوں کی پالیسی اور پروگرام پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنا یا اسلام کو ایک نظام حیات کے طور پر پیش کرنا ایک سنگین جرم ہے۔حتیٰ کہ بعض اوقات اس جرم میں آپ جان سے بھی ہاتھ دھو سکتے ہیں۔اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو انسانی حقوق سے متعلق جس عالمی منشور کا اعلان کیا تھا اس کی دفعہ ۱۹ آزادئ اظہار خیال کا حق دیتی ہے مگر اِن ممالک میں اِس بنیادی حق کا استعمال ممنوع، حرام اور ناجائز ہے۔

اسلام کا نظریۂ آزادی :

بلاشبہ اسلام انسانی آزادی کا سب سے بڑا داعی اور علمبردار ہے۔انسانی مجد وشرف کی بحالی اور بنیادی قدروں کے استحکام کا علمبردار قافلہ جس نے فی الحقیقت انسانی آزادی کے تحفظ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے اور انسان کو حقیقی آزادی کا شعور بخشا، وہ انبیائے کرام کا قافلہ تھا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم اور اس کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔چنانچہ انہوں نے فرعون کے بھرے دربار میں دعوت حق کے ساتھ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا : قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ (اعراف: ۱۰۵)

''میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی جانب سے واضح دلیل لے کر آیا ہوں، لہٰذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو''۔دوسرے مقام پر قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے :

أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ''اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں''۔(الدخان: ۱۸)

قرآن کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی علاقے پر دشمن کے قبضے، اس کے ظلم وستم اور غلامی کی زندگی سے نجات و آزادی کے حصول کے لیے باضابطہ تیاری کے ساتھ لڑائی بھی کی جانی چاہئے۔سورۃ البقرہ کی آیت ۲۴۶ تا ۲۵۱ میں مفسرین کے مطابق تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد فلسطین میں اُس وقت بنی اسرائیل کے بڑے علاقے پر اُن کے دشمن (عمالقہ) قابض ہو گئے تھے۔حتیٰ کے ان کا قبلہ اور وہ صندوق جس میں موسیٰ اور آل ہارون علیہم السلام کے تبرکات تھے وہ بھی ان کے قبضہ میں چلا گیا

تھا۔اُس وقت بنی اسرائیل میں حضرت سموئیل علیہ السلام نبی کی حیثیت سے موجود تھے جو کافی بزرگ ہو چکے تھے۔ طالوت کی قیادت اور سربراہی میں دشمنوں سے لڑائی ہوئی جس میں حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔ بالآخر اللہ کے اذن سے بنی اسرائیل نے دشمنوں کو مار بھا گیا اور اس طرح بنی اسرائیل کو جالوت، اس کے لشکر اور عمالقہ سے آزادی نصیب ہوئی۔

قرآن مجید میں اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اُس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے''۔ (النساء:۷۵)

معلوم یہ ہوا کہ دنیا کے کسی بھی خطے یا علاقے میں اگر مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو تختۂ مشق ستم بنایا جائے اور وہ غریب اپنے آپ کو ظلم وستم سے بچانے اور ہجرت پر قادر نہ ہوں تو انہیں اس ظلم سے بچانا اور ظالموں کے چنگل سے آزادی دلانے کے لیے دیگر مسلمانوں اور اُن کی حکومتوں کو آگے بڑھ کر اپنی استطاعت کے مطابق باضابطہ جہاد کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کا ایک معروف واقعہ ہے کہ جب سندھ کے راجہ داہر کے قید خانے سے ایک مسلمان خاتون نے اموی خلیفہ معتصم باللہ کو خط لکھ کر قید و بند کی اپنی المناک داستان سنائی تو ظالم گورنر حجاج بن یوسف کی غیرت وحمیت بھڑک اٹھی اور اس نے ۱۷ سالہ نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا جس نے بالآخر سندھ فتح کیا اور خواتین سمیت متعدد مسلمانوں کو ہندو راجہ کی قید سے آزادی دلائی۔

بدقسمتی سے آج اقوام متحدہ اور نیشنل ازم کے طاغوت نے مسلمان ممالک اور حکومتوں کو اس قدر بے دست و پا بنا دیا ہے کہ وہ فلسطین، برما، شام، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے مظلوم مسلمانوں کی آزادی کے لیے لڑائی تو دور کی بات ہے کوئی مؤثر سفارتی، مالی اور اخلاقی جدوجہد بھی نہیں کر پا رہے ہیں۔ قرآن مجید کے اس واضح حکم کو اجتماعی طور پر پس پشت ڈال دینا اسلامی تاریخ کا ایک المناک حادثہ ہے۔

قافلۂ رسالت کے سالار اور گُل سرسبد رحمت عالم ﷺ کی بعثت ایسے ماحول میں ہوئی جب پورا انسانی کنبہ اوہام وخرافات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور خود انسان اپنے جیسے انسانوں کی باضابطہ غلامی کا شکار تھے۔ عورتوں سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا جاتا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں نبیٔ رحمت ﷺ انسانوں کو آزادی وحریت سے ہم کنار کرنے کے لیے تشریف لائے اور آتے ہی اعلان کر دیا کہ ''میں اس شخص کے خلاف مدعی اور وکیل استغاثہ ہوں گا جو آزاد انسانوں کو غلام بناتا ہے''۔ (صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا)

قرآن میں خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ. (اعراف: ۱۵۷)

''اور نبی ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے''۔

درحقیقت اسلام جسم کے ساتھ روح کی آزادی کا بھی داعی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حقیقی آزادی یہ ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ انسان کی روح بھی اوہام وخرافات، باطل افکار ونظریات، غیر اللہ کی عظمت و بندگی اور کفر وشرک سے مکمل طور پر آزاد ہو۔ چنانچہ بنی نوع انسانیت کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے پہلی بار انسانی حقوق کا ایک عالمی منشور دنیا کے سامنے پیش کیا تھا:

''لوگو! بے شک تمہارا رب اور تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی

فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی ہے۔ جو خود کھاؤ وہی اپنے غلاموں کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنو وہی اُن کو بھی پہناؤ۔ جاہلیت کے تمام خون باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون باطل کر دیتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان (عباس بن عبدالمطلب) کا سود باطل کرتا ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرتے رہو۔ جس طرح تمہارا حق عورتوں پر ہے اسی طرح عورتوں کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام ہے''۔

عصر حاضر میں آج جہاں کہیں بھی اور دنیا کے جس فورم سے بھی حقوق انسانی کی بات ہوتی ہے اور Human Right کا چارٹر وجود میں آتا ہے وہ دراصل رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور احکامات و ہدایات کا پرتو نیز آپؐ کی دعوت کی صدائے بازگشت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں انسانوں کو غلام بنا کر رکھنے کا عام رواج تھا۔ اُن کی خرید فروخت ہوتی تھی اور اُن کے مالکانہ حقوق حاصل ہوتے تھے۔ اسلام نے اسے ناپسند کیا اور اس کے خاتمے کی ترکیبیں بتائیں۔ مختلف مواقع پر غلاموں کو آزاد کرنے کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے اور اس کی ترغیب دی گئی۔ کفارے کے طور پر غلام آزاد کرنے کی مختلف صورتیں تجویز کی گئیں۔

سورہ توبہ کی آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کے مصارف بیان کیے گئے تو اُن میں ایک مصرف ''فی الرقاب'' یعنی غلام کی آزادی کے لیے زکوٰۃ کی رقم کو استعمال کرنے کا حکم دیا گیا۔ سورہ بلد میں ''فَکُّ رَقَبَةٍ'' یعنی غلام آزاد کرنے کو نیکی کا ایک اہم کام قرار دیا گیا۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے متعدد احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا، ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، شرم گاہ کے بدلے میں شرم گاہ''۔ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

حضرت علی بن حسینؒ (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شعبیؒ نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قصداً روزہ توڑنے کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

عقیدۂ توحید دراصل انسانی آزادی کا مژدہ اور اس بات کا اعلان ہے کہ اب انسان ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو کر صرف خدا کا بندہ بن کر رہے گا۔ اُس پر کسی مخلوق کی حاکمیت نہیں ہوگی۔ پھر شریعت اسلامی نے قدم قدم پر آزادی کے اس فطری جذبہ کا لحاظ رکھا۔ چاہے مسئلہ نکاح کا ہو یا خرید و فرخت اور مالی معاملات کا۔ اسلام کے سیاسی نظام کی تنفیذ پیش نظر ہو اور انتخاب امیر کی نوبت آئے' ہر جگہ حق آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام کے اسی تصور آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک موقع پر خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے مصر کے گورنر عمر بن العاصؓ اور ان کے بیٹے کو ایک معاملے میں زیادتی کے سبب طلب فرمایا اور عدل کا تقاضا پورا کرنے کے بعد تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

مَتیٰ اِسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَاراً '' لوگوں کو اُن کی ماؤں نے آزاد جنا تھا، تم نے کب

سے اُن کو غلام بنالیا؟'' (اخبار عمرؓ، علی طنطاوی، ص۱۸۴)

۵ نبوی میں ہجرت حبشہ کے موقع پر نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر ؓ نے جو خطاب کیا ہے اس کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت انسانوں کو ظلم وستم، جہالت، اوہام و خرافات، رسوم ورواج اور شرک وبت پرستی سے آزادی اور نجات دلانے کے لیے ہوئی تھی۔ حضرت جعفر ؓ نے فرمایا :

''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، پڑوسیوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اسی اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق ودیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اُس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں۔ چنانچہ ہم اُس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں واپس چلے جائیں''۔ (سیرت النبیؐ، حصہ اول، ص۱۶۹)

۱۵ھ ہجری میں حضرت عمر فاروق ؓ کا عہد خلافت تھا، جنگ قادسیہ سے قبل مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان سفارتی کوششیں جاری تھیں۔ اسی دوران حضرت ربعی بن عامر ؓ ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں مسلمانوں کے سفیر بن کر گئے اور اس سے واضح اور دوٹوک انداز میں فرمایا ''اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لائیں'' :

'' اِبْتَعَثَنَا اللّٰهُ لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبادِ اِلىٰ عِبادَةِ اللّٰهِ وَحدَهُ وَمِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا اِلىٰ سَعَتِها وَمِنْ جَورِ الْاَدْيانِ اِلىٰ عَدلِ الاِسْلَامِ ''(ابن کثیرؒ۔ البدایہ والنہایہ، جزء السابع، ص۳۹-۴۰)

''اللہ نے ہمیں بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ واحد کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر اس کی وسعتوں میں داخل کریں اور مذہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سائے تلے لے آئیں''۔

عہد فاروقی ہی میں مکہ کے گورنر حضرت نافع بن حارث ؓ مدینہ تشریف لے گئے تو اپنے آزاد کردہ غلام ابن امیری ؓ کو مکہ میں اپنا نائب بنا کر آئے۔ حضرت عمر ؓ نے جب ان کی صفات سنیں تو بے انتہا خوش ہوئے۔

اسلام آزادی کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق نہیں برتتا۔ چنانچہ فقہاء نے اس سلسلے میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ '' لهُمْ ما لنا و عليهِمْ ما عَلينا '' اُن کے (یعنی ذمیوں کے) بھی وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور ان کی بھی وہی ذمہ داری ہے جو ہماری ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلم ریاست کے غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے متعلق فرمایا: من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة (بخاری، کتاب الدیات) ''جس نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکے گا''۔

اسلام کی عطا کردہ اِس ہمہ گیر اور بے نظیر آزادی کی فیوض و برکات سے دنیا اسی وقت مستفید اور متمتع ہوسکتی ہے جب مسلمان ہی نہیں اسلام بھی سیاسی طور پر کسی خطے میں آزاد ہو۔ کاش ہماری آنکھیں جیتے جی اسلام کی سیاسی آزادی کا سورج طلوع ہوتے دیکھ پاتیں۔ اللّٰهُم وَفِّقْنَا لِما تُحِبُّ و تَرْضىٰ . آمین

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

کھیل:

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ کھیل کوئی اہم موضوع نہیں ہے، مگر صحیح معنی میں اس موضوع کو بھی ہمیں اچھے طریقہ سے بالخصوص نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے برتنا چاہیے، اس لیے کہ انسانی زندگی میں کھیل کی بڑی اہمیت ہے، بالخصوص بچے کے نمو اور شخصیت کی تشکیل وتکوین کے ایام میں اس کی بڑی اہمیت ہے، بچہ کھیلوں کے ذریعہ خود اپنی شخصیت وصلاحیت کے متعلق بہت کچھ سیکھتا ہے، ساتھ ہی لوگوں کے متعلق اور خود زندگی کے متعلق بہت کچھ سیکھتا ہے، جب بچہ کسی وقت کسی کھیل سے لطف اندوز ہوتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش کی دنیا کے ذریعہ ان اشیاء کی خصوصیات سے واقف ہوتا ہے، جس عالم جمادات میں وہ زندگی بسر کرتا ہے اس میں مرکب مواد اور منفرد اشیاء کی خصوصیات ومزاج سے متعلق اس کو معلومات حاصل ہوتی ہیں، اسی طرح جب کنکر وپتھر سے کھیلتا ہے تو اسے مواد کے بھاری پن کا پتہ چلتا ہے اور زمین کی جاذبیت کی فکر اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے، جب بچہ گڑیا اور گڈے سے یا چور سپاہی کے قسم کا کوئی کھیل کھیلتا ہے تو اسے انسانی تعلقات سے متعلق خیالات و احساسات کو الفاظ میں بیان کرنے کا موقع ملتا ہے، اسی طرح جب مختلف رنگوں والے قلم(sketches and coloured chalks or coulared chals) سے کھیلتا ہے تو اسے اشکال والوان سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں، گویا تفریحی کھیل کی تقریبا ہر قسم ونوعیت میں یہ خصوصیت موجود ہے کہ بچہ کو اس کے ذریعہ بہت سی چیزیں سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عام طور پر بچے کچھ سیکھنے کے لیے نہیں کھیلتے، بلکہ وہ تو محض تفریح اور اپنی تسلی کے لئے کھیلتے کودتے ہیں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ بغیر ارادے کے بھی کھیل سے زندگی برتنے کے طریقے سیکھتے ہیں، عام طور پر عمر کے ابتدائی مرحلہ میں بچے کھیل اور کام میں فرق نہیں کرتے، اس مرحلہ میں بچے کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ کچھ اعمال وافعال اور سرگرمیاں Activities تو اس کے نزدیک باعث لطف ہوتی ہیں اس لیے وہ انھیں انجام دیتا ہے، اس کے برعکس کچھ افعال اس کے لیے بے کار وبے مزا ہوتے ہیں اس لیے وہ ان سے دور رہنے اور کنارہ کشی کرنے کو ہی افضل سمجھتا ہے، پھر وہ اپنی اسی دلچسپی ولطف اندوزی کے سبب ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں ماحول اور لوگوں کے سلسلہ میں مختلف طرح کی معلومات حاصل کرتا ہے، خود اپنی ذات سے واقف ہوتا ہے، جو کچھ وہ کرسکتا ہے اور جو نہیں کرسکتا، اسے اس طرح اپنی اس صلاحیت کے بارے میں بھی علم ہوتا ہے، ساتھ ہی اسکو اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اسے کاموں کو انجام دینے کے لیے کس طرح مہارتوں اور معلومات وتجربات کی ضرورت ہے۔

آپ اگر اپنے بچے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو جب وہ

کھیلے تب اس کو دیکھیے اور غور کیجئے، آپ اس کو دیکھیں گے کہ وہ اپنے پاس موجود اشیاء کو کس طرح برتنا سیکھ رہا ہے اور کیسے وہ ماحول کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کو گڑیا یا دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر آپ اس کے شخصی مزاج کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں جو ان دنوں تشکیل وتکوین کے مرحلہ میں ہوتا ہے، مثلاً آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا وہ مشکل کا مقابلہ کرنے میں عزم کا مالک اور سخت کوش ہے؟ یا چیلنجز کے سامنے بہت جلدی سرینڈر کر دیتا ہے؟ کیا کھیل میں دوسروں کو شریک کرنے کا رجحان رکھتا ہے یا صرف وہ تنہا کھیلنے کو ترجیح دیتا ہے؟ وہ مزاجاً سلبی ہے، توڑ پھوڑ کرتا ہے یا ایجابی ہے اور احتیاط برتتا ہے؟ اگر خلاف امید نتیجہ آئے مثلاً کھیل میں ہی وہ ہار جائے تو چیختا چلاتا، بھڑکتا اور روتا ہے؟ یا پھر نتیجہ پر خاموش رہتا ہے اور قانع ہوتا ہے؟ جب وہ دوسرے بچوں کو کھیل میں کامیاب و فتح یاب ہوتے دیکھتا ہے تو ان کی خوشی اور جشن میں شریک ہوتا ہے یا پھر غیرت کھاتا ہے، اور غصہ سے بھر کر پریشان ہوتا ہے؟

اس طرح آپ اس کے نشو نما کے مراحل سے بخوبی واقف ہو سکیں گے اور آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ کب اسے آپ کی مدد کی ضرورت ہے اور کب اسے آپ کو تنہا چھوڑنا چاہیے کہ وہ خود تصرف کرے، کب آپ کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور کب اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، اس طرح آپ کو بچے کے مراحل نمو میں کھیل کی اہمیت کا بھی صحیح اندازہ ہوگا۔

عام طور پر بچہ ولادت کے بعد سے ۱۶ سال کی عمر تک کھیلوں سے دلچسپی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے، عمر کے اس مرحلہ میں (۱۶ سال) پہنچ کر اس کی دلچسپی والے کھیلوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے، جن کھیلوں پر وہ توجہ دیتا تھا، اور جن میں وہ شرکت کرتا تھا ان سے اس کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے، نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ جو کام بھی کرتا ہے اس میں تخصص (specialization) کی صفت زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور وہ اسی چیز پر توجہ مرکوز کرتا ہے جس میں اس کو اچھی مہارت حاصل ہوتی ہے، اگر چہ ہم اس کو مرحلہ واریت کا نام دیتے ہیں لیکن فی الحقیقت ان مراحل کے درمیان فصل کرنے والی بہت نمایاں حدود ہیں، کیوں کہ فطری طور پر بچوں میں انفرادی نوعیت کے بہت سے فرق وتفاوت پائے جاتے ہیں، بہر حال عمر کے ابتدائی مرحلہ میں بچہ مختلف کھیلوں اور متعدد سرگرمیوں Activities کی طرف مائل ہوتا ہے، بلا شبہ اس سے اس کے بہتر نمو میں مدد ملتی ہے اور وہ زندگی کے مختلف تجربات حاصل کرتا ہے۔

والدین کے لیے بہتر ہے کہ ان کے سامنے کھیلوں اور کھلونوں کی کیفیت وخصوصیت اور مزاج بالکل واضح ہو، ان کو معلوم ہو کہ کس عمر میں کون سا کھیل مناسب ہے، اور بچے کے نمو کے مختلف مراحل میں کون سے کھیل ان مراحل کے موافق ہیں، نیچے کے جدول میں اس کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا مرحلہ: عمر: اولین ۳ ماہ:

بچہ کو کیا پسند ہوتا ہے	کھیل کی کیفیت ونوعیت
اس کے آس پاس ہونے والی حرکات اس کو لبھانے والی آوازیں، پیار بھرا لمس	ماں باپ کے ساتھ کھیل (اٹھکھیلیاں) (بلکہ یہ تو عمر کے ہر مرحلہ میں مفید ہے)

دوسرا مرحلہ: عمر: ۳ ماہ سے ۶ ماہ:

بچہ کو کیا پسند ہوتا ہے	کھیل کی کیفیت ونوعیت
خود اپنی جسمانی حرکتیں، ہاتھ پاؤں چلانا وغیرہ، گیت لوریاں، منہ سے نکلنے والی آوازیں، مختلف روشنی والی چیزیں، والدین کی حرکات و سکنات	وہ چیزوں کو پکڑتا ہے انھیں ہلاتا ہے، ہلنے والے کھلونے، لٹکنے والے کھلونے، نرم کھلونے، کسی برتن یا ڈبہ وغیرہ میں رکھی ہوئی چیزیں، اسی طرح اس کو ایسی سطح زمین پسند ہوتی ہے جس پر وہ لڑھک سکے، والدین کی گود میں اچھلنا کودنا، والدین کی آواز سننا، والدین کے چہرے کو چھونا اور اس سے کھیلنا، اپنے ہاتھوں کو ہلانا اور انھیں دیکھنا، نرم تر چیزوں کو منہ میں رکھنا، روشن اور ہوادار کمرہ۔

تیسرا مرحلہ: ۶ ماہ تا ۱ سال:

بچہ کو کیا پسند ہوتا ہے	کھیل کی کیفیت ونوعیت
گھر کا ماحول، والدین کے کام، جسمانی سرگرمیاں، متحرک اشیاء، تلاش و تحقیق والی چیزیں، تقسیم کرنے والی چیزیں، آواز نکالنے والی چیزیں، تکرار عمل، پانی، دوسروں کی تقلید، آوازیں بلند کرنا۔	کھیلنے اور حرکت کرنے کے لئے وسیع جگہ، گھر کے سامان، گھر میں کام کرتے ہوئے ماں باپ کو دیکھنا، غسل خانہ میں پانی سے کھیلنا، ایسی چیزیں جو لڑھکتی ہوں گھومتی ہوں، ایسے کھیل جن میں چھپنے اور ظاہر ہونے کی صفت پائی جائے، دھکا مکا والے کھیل، لکڑی کے ٹکڑے جن سے وہ کچھ بنا سکے اور بگاڑ سکے، ایسا ڈبہ جس میں کچھ دیگر چیزیں بھی ہوں، لوگوں کی تقلید، ایسی چیزیں جن کو وہ پھاڑ سکے، ایسے لوگ جو اس کے کھیل اور اس کی آوازیں برداشت کر سکیں، کمرے کے فرش پر اتھل پتھل۔

چوتھا مرحلہ: ۱ سال تا ۳ سال:

بچہ کو کیا پسند ہوتا ہے	کھیل کی کیفیت ونوعیت
چیزوں کی قطار بنانا، دیگر بچے، سیال چیزوں کو بہانا، چیزوں کو چھپانا، کھٹکھٹانے والی چیزوں سے کھٹکھٹانا، دوسروں کی مدد کرنا، بازاروں میں رکھا ہوا سامان، خود اپنا جسم اور اپنے اعضاء، پانی کی ٹونٹیاں، چھان بین اور کھوج کرید، بچوں کے گیت، چھوٹی چھوٹی کہانیاں، ٹیلی ویژن، چلنا، گفتگو کرنا، تیرا کی، موسیقی، جو چاہتا ہے اس کا اختیار ہو، لکھنا، کھنچانا، گودنا۔	چلتی پھرتی گاڑیاں، جھولنے والے کھیل، رسی کے ذریعہ کودنے والا کھیل، گیند، نرم کھلونے، تعمیر و تطبیق کے لیے لکڑی کے چوکور ٹکڑے، ایسے لوگ جو اسے کچھ پڑھ کر سنائیں، ایسے لوگ جو زمین پر اس کے ساتھ بیٹھیں، بچوں کی گھات میں رہنا اور ان کے ساتھ کھیلنا، ایسی چیزیں جو اس کے لیے خاص ہوں، ایسی مامون جگہیں جہاں وہ چھپ سکے، ایسی مامون جگہیں جہاں پھسل سکے اور کود پھاند سکے، بٹن اور کنجی جیسی چیزیں، پانی اور ریت، ٹی وی پر بچوں کے پروگرام، رنگین تصویروں والی کتابیں، سوئمنگ پول، کشادہ جگہ جہاں کہ وہ اپنی چیزوں کو مرتب کر کے رکھ سکے،، ایسے لوگ جو اس کی باتیں سنیں، اس کے پیشاب کرنے کی خاص پوٹی، بار بار مارکیٹ جانا اور گھومنا، قلم کاغذ، مختلف رنگ وشکل کی چیزیں تا کہ وہ انھیں ترتیب دے سکے۔

پانچواں مرحلہ: ۴ تا ۵ سال:

بچہ کو کیا پسند ہوتا ہے	کھیل کی کیفیت ونوعیت
تخیلاتی کھیل، اجتماعی کھیل، اعداد، اچھلنا کودنا (jump)، باورچی، خانہ اور پکانا، رنگ کرنا، آلات موسیقی، لمبی کہانیاں، پھسلنا اور، گھریلو کام کاج، گھر سے باہر کے کام کاج، لباس اور بننا سنورنا، تعمیر و ترتیب، مقابلہ آرائی، حفظ ویادداشت والے کھیل، پہیلیاں اور چٹکلے، چیزوں کو، جمع کرنا (جیسے ڈاک ٹکٹ اور، چھوٹے کارڈ وغیرہ)، دوسرے کے جسم، پڑھنا، سیکھنا، لکھنا سیکھنا، وقت سمجھنا، پودے اور کھیتی، نغمے اور گیت، اختراع وایجاد۔	گڑیا، گاڑیاں، اور چور پولیس کے کھیل، میکینکل کھیل، گیند اور بلا، فٹبال، پالتو جانور جیسے بلی مچھلی وغیرہ، پارکوں میں عام کھیل، پھسلنے والے زینے، جھولے، بڑا کرٹوں جس میں وہ گھس جائے، ساتھ میں کھیلنے والے، کھیل کا میدان، انگلیوں اور رنگوں سے تصویریں بنانا، مختلف شکلیں بنانے کے لئے رنگین مٹی (playing clay)، روٹی پکانے کے لئے آٹا، کاٹنے اور چپکانے کے لئے پرانے میگزین، کچے کھیلنا، الفاظ اور تصویریں ملانے والے کھیل، مقابلہ آرائی والے کھیل، سی ڈی، کیسیٹ، بیٹری اور چراغ جیسے کھلونے، کتابیں، سوتے وقت کی کہانیاں، کھیتی کے لیے دانے، کمپیوٹر کے کھیل، پارکوں اور عام جگہوں پر گھومنا، فیملی کے ساتھ سفر کرنا اور سیر کے لیے جانا، میوزیم وغیرہ کی ہلکی پھلکی سیاحت، چیزوں کو جمع کرنا (جیسے پتھر، کارڈ اور درخت کے پتے وغیرہ)، کھلونے رکھنے کے لیے صندوق، آلات موسیقی، رنگ اور تصویر والی کتابیں۔

یہاں بطور تاکید دوبارہ یہ بات عرض کی جاتی ہے کہ بچے کے کھیل پر والدین کو توجہ دینا چاہیے کیوں کہ اس کا کھیل والدین کے احساس اور نگرانی پر ہی بڑی حد تک موقوف ہے، جس قدر وہ اس کی ضرورتوں کا احساس کر سکیں گے اسی قدر انھیں پوری کر سکیں گے، والدین کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ چیزوں کو بچوں کی نظر سے دیکھیں، اس لیے کہ بسا اوقات بعض چیزوں کی طرف بڑوں کی توجہ نہیں ہو پاتی مگر بچے کے لے وہی چیزیں بڑے شوق و رغبت کی ہوتی ہیں، جب واقعی چیزوں کو بچوں کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں گے تو خود والدین کو اپنا بچپن یاد آئے گا، اور بہت سی وہ چیزیں ذہن کے

پردے پر ابھر کر آئیں گی جن سے چمٹے رہنا وہ پسند کرتے تھے، اس طرح والدین کے لیے بچے کے احساسات کو اور اس کے مزاج کو سمجھنا آسان ہوگا، اور اس کی ضروریات کو بہتر طریقہ سے پورا کرنے میں بھی مدد ملے گی،

بچوں کے لیے کھلونے خریدنا:

اوپر دیے گئے نقشہ میں آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ چھوٹے بچوں کے لیے بہترین کھلونا گھر میں روزمرہ مستعمل ہونے والی چیزیں ہوتی ہیں، جیسے پلاسٹک کی دودھ کے لیے استعمال ہونے والی ڈولچی یا کچن میں پانی کے لیے استعمال ہونے والے پاٹ اور خالی کارٹن وغیرہ، جس سے وہ کھلونے اور کشتی وغیرہ بنا سکیں، بچوں میں عام طور پر یہ عادت وصلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ کسی بھی چیز کی ہیئت کو تبدیل کر کے اسے اپنے لیے مفید کھلونا بنا لیتے ہیں، چنانچہ اس کے ہاتھ میں کوئی چھوٹا ٹکڑا کارٹن یا کسی چیز کا پہنچ جائے، تو وہ ایسا کھلونا بن جاتا ہے جو زندگی سے بھرپور نظر آتا ہے، کوئی خالی ڈبہ اسے مل جائے تو اسے گھر، گاڑی یا فوجی ٹینک یا جہاز میں بدل لیتا ہے، چنانچہ اگر آپ کو یہ اطمینان ہو کہ ان چیزوں سے کھیلنے سے کوئی نقصان نہیں، تو بچے کو ان ہی چیزوں سے کھیلنے دیں اور کوشش اس بات کی کریں کہ بچے کے تصور و خیال کے سامنے آپ کا سلبی موقف نہ آنے پائے، مثلاً اگر بچہ آپ سے کہے کہ یہ ڈبہ نہیں گاڑی ہے تو آپ اس کے خیال کو غلط ثابت کرنے میں جلدی نہ کریں کہ آپ کہہ دیں کہ ''یہ گاڑی نہیں ڈبہ ہے، اس کو تم گاڑی نہیں کہہ سکتے''، کیوں کہ بچے کے لیے وہ ایک مکمل گاڑی ہے جو چلتی ہے جس کے پہیے ہوتے ہیں، اس کے برخلاف آپ کو اس کے تصور کے مطابق اختراع وابداع کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔

اسی طرح یہ کوشش کرنا چاہیے کہ بچوں کے کھیل اور کھلونوں میں زیادہ مداخلت نہ کی جائے، چنانچہ اگر اس کو کوئی کھلونا بہت پسند ہے اور وہ پوری طرح اس پر فریفتہ ہے، اسی پر توجہ رکھتا ہے تو اس کو اس کے اس خیال کے ساتھ جینے دینا چاہیے، یہ قطعی ضرروی نہیں ہے کہ اس کے پاس جو کھلونا ہو اس کے متعلق وہ والدین کو بتائے، اسی طرح والدین کو یہ بتانے کی بھی جلدی نہیں کرنا چاہیے کہ بچہ کھلونا کس طرح استعمال کرے کہ اچھی حالت میں باقی رہے اور کس طرح کھیلے، اس کو چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ خود ہی اس کھلونے کا تجربہ کرے، البتہ جب وہ مدد کا مطالبہ کرے تو ضرور مدد کرنا چاہیے، یا جب واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ معاملہ اس کی طاقت وصلاحیت سے آگے کا ہے اور اس کو یقینی طور پر مدد کی ضرورت ہے تب اس کی مدد کرنا چاہیے، لیکن ایسے موقع پر بھی کوشش یہ کرنا چاہیے کہ اس سے سوالات کیے جائیں اور سوالات کی مدد سے اس کے تصور کے سامنے نئے احتمالات پیش کیے جائیں نہ کہ فوری طور پر بس اس کی مدد کر کے درپیش شکل کو حل کر دیا جائے۔

مثلاً کہا جائے ''اگر تم ایسا ایسا کرو گے تو اب کیا ہوگا''؟ مثلاً ''اگر تم اس کو یہاں سے ہٹا کر ذرا اوپر کر دو تو کیا ہوگا''؟

بچے کو چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی صلاحتیوں اور اپنے امکانات پر اعتماد کرنا سیکھے، اور اپنی مشکلات کو خود حل کرنے کی کوشش کر سکے، والدین کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے نہ کہ فرط محبت میں فوراً ہی اس کی ہر مشکل کو حل کر دینا چاہیے۔

سطور بالا سے یہ بات واضح ہوگئی کہ گھر کے سامان کو بطور کھلونا استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن بچے کے لئے کھلونے خریدنے یا اسکول اور تعلیم وتعلم سے متعلق مخصوص کھلونے خریدنے کی اہمیت پھر بھی باقی رہتی

ہے، لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ بیشتر کھلونے بڑے مہنگے ہوتے ہیں، اور کچھ ہی دنوں بعد بچہ ان سے اکتا جاتا ہے، پھر وہ اس کھلونے میں دلچسپی نہیں لیتا جس کو مہنگا ہونے کے باوجود خریدا گیا تھا، وہ اس کو اٹھا کر اپنی الماری میں رکھ دیتا ہے، یہ ملحوظ رہے کہ جب بچہ کسی کھلونے میں دلچسپی نہ لے تو اس سے کھیلنے پر اس کو مجبور نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ اگر وہ دباؤ کی صورت میں آپ کے سامنے اس سے کھیلنے بھی لگے تو بھی وہ اس کو اندر سے ناپسند کر رہا ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ناپسندیدگی اس کے ٹوٹنے کا سبب بنے گی، وہ اسے توڑ دے گا اور آپ سے کہے گا کہ اچانک ٹوٹ گیا۔

اگر بچہ کسی کھلونے کو خریدنے کی بہت ضد کرے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ لمبی مدت تک اس کو محبوب بھی رکھے گا، اس سے کھیلے گا، اس لیے کہ عمر کے اس ابتدائی مرحلہ میں بچے کے اندر یہ اندازہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ کون سے کھلونے کی خوبصورتی اور کشش کب تک باقی رہے گی، کس کھلونے سے زیادہ دنوں تک اور کس سے تھوڑی مدت تک فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس لیے وہ کسی بھی کھلونے پر فریفتہ ہوکر ٹوٹ پڑتا ہے مگر جلد ہی وہ اس کی ظاہری خوبصورتی سے دھوکہ کھا جاتا ہے، کیوں کہ اس پر جس طرح کا کور چڑھایا گیا تھا اور جس طرح خوبصورت اور قیمتی اس کی پیکنگ (packing) تھی دراصل اندر سے اس کو اس قدر مضبوط نہیں بنایا گیا تھا، اسی طرح بعض کھلونوں کے اشتہارات کے سبب بھی دھوکہ کھانا پڑتا ہے۔

کارگر اور مفید کھلونوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچے کی قوت تفکیر اور ابداع واختراع کی صلاحیت کو پروان چڑھائے، اس کو سوچنے پر مجبور کرے، یہ کھلونا ایک خالی کارٹن بھی ہوسکتا ہے، جس کو بچہ کبھی کار بنالیتا ہے، تو کبھی ٹینک اور کبھی کشتی بنالیتا ہے، کبھی ہوائی جہاز، کبھی وہ اس کارٹن میں سوراخ کرتا ہے پھر اس میں ایک لکڑی لگا دیتا ہے، اس طرح اس میں اضافہ کرنے کے احتمالات اس کے نزدیک ختم نہیں ہوتے، وہ جو کچھ بھی پاتا ہے اس میں جوڑ دیتا ہے اور کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اسکے برخلاف جن کھلونوں میں کچھ پیچیدگی ہوتی ہے اور جنہیں بچہ سمجھ نہیں پاتا ان سے اکثر وہ جلدی اکتا جاتا ہے اور بیزاری کا اظہار کرتا ہے،

اسی طرح کھلونوں کے مفید ہونے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بچے میں تجسس پیدا کرتے ہوں، اس کے اندر شوق ابھارتے ہوں، اس کو کچھ کرنے پر آمادہ کرتے ہوں، اگر مشکلات کو حل کرنے، پہیلیوں جیسے مسائل کا حل تلاشنے کی عادت نہ ہوتی تو انسانی زندگی کے بہت سے پہلو پیچیدہ رہ جاتے، انسانی زندگی اس قدر ترقی یافتہ نہ ہوتی اور زندگی کے بہت سے اختراعی، علمی اور صنعتی پہلو ہنوز آنکھوں سے اوجھل ہوتے، یہی وجہ ہے کہ انسان پہیلیوں اور پہیلی جیسے کھیلوں اور ان کا حل تلاشنے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔

بچہ ایسے کھلونوں سے بھی محظوظ ہوتا ہے جو اسے متعین قسم کی صلاحیتوں سے واقف کراتے ہیں، جیسے رنگین مٹی (playing clay) اور مختلف قسم کے رنگ، اسی طرح بڑے جو کچھ بناتے ہیں بچہ اسے بھی کھیل سمجھ کر اس سے محظوظ ہوتا ہے جیسے جب آٹا گوندھنے، پیڑا بنانے، روٹی بنانے یا مٹھائیاں بنانے کو بچہ بڑوں کا کھیل سمجھتا ہے اور پھر ان سے محظوظ ہوتا ہے۔

والدین کو اس حقیقت سے بھی واقف ہونا چاہیے کہ بچہ جس قدر کھیل کے دوران انجام پانے والے کاموں سے لطف اندوز ہوتا ہے اس قدر اس کے نتیجہ سے نہیں ہوتا، بچہ جوڑ توڑ کرتا ہے اور مختلف چیزوں کو ملا کر کوئی کھلونا بناتا ہے تو اس کو جو لطف یہ

سب کرنے میں آتا ہے وہ اس کے تیار ہوجانے کے بعد نہیں آتا اور نہ ہی اسے اس سے کوئی سروکار ہوتا ہے کہ اس میں اس کا کتنا وقت لگا، اور جو چیز تیار ہوئی وہ کسی کام کی ہے بھی یا نہیں، مثلاً ماں جب آٹا گوندھنا شروع کرتی ہے تو بچہ ساتھ لگ جاتا ہے، اس کے اندر اس بابت ماں کی مدد کرنے کا شوق ہوتا ہے اور وہ مستقل ساتھ میں ادھر ادھر کرتا رہتا ہے اور محظوظ ہوتا رہتا ہے، جتنی توجہ وہ اس پورے دورانیہ میں دیتا ہے، روٹی تیار ہوجانے کے بعد روٹی پر اس کی اتنی توجہ نہیں ہوتی، کیوں کہ روٹی بنانا اس کی نظر میں ایک کھیل تھا، یہی چیز بڑوں کے لئے بڑی عجیب ہوتی ہے، کیوں کہ بڑوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جلد کسی معین نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بچوں کا مقصد نتیجہ سے قطع نظر محض تسکین و تسلی اور لذت کا حصول ہوتا ہے، اسی لیے بچہ مختلف رنگوں کو ملانے اور رنگ کرنے سے محظوظ ہوتا ہے، اس کو تو رنگین مٹی clay کو توڑنے اور جوڑنے میں مزا آتا ہے، اس کی شکل تبدیل کرنے سے ہی وہ لطف اندوز ہوتا ہے، اس کو اس سے مطلب نہیں ہوتا جو مشکل بن رہی ہے وہ کیا ہے اور کیسی ہے۔

اس کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ آپ اس عمل پر اس کی باز پرس کریں گے اور اس کو کچھ کہیں گے، صحیح بات یہ ہے کہ آپ کو اس معاملہ میں اس کو کچھ کہنا بھی نہیں چاہیے، یہ بات ہمارے سوچنے کی ہے اور اس سلسلہ میں اپنا موقف درست کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم بچے کی اس کام سے دلچسپی اور لطف اندوزی کو بھول کر بس ہر وقت آخری نتیجہ پر نظر رکھتے ہیں، اور اس کی خاطر کبھی بچے کی گرفت بھی کر لیتے ہیں، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ہمیں ہر چیز کو بچے کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔

اجتماعی کھیل:

عمر کے تیسرے سال میں بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا عموماً شروع کرتا ہے، جس کو ہم اجتماعی کھیل کا عنوان دیتے ہیں، اس مرحلہ میں وہ دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان سے گفتگو کرتا ہے، کبھی کبھی دوسروں کے ساتھ محض کسی کھلونے کو حاصل کرنے کی خاطر گھلتا ملتا ہے، یہ سب چیزیں ایسے کھیل کی ابتدائی علامتیں ہوتی ہیں جس میں بچے ایک ساتھ مل کر کھیلتے ہیں اور ایک ہی سرگرمی (Activity) سب شریک ہوتے ہیں، ہر بچہ اس اجتماعی کھیل میں اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے، صحیح معنی میں اجتماعی کھیل میں بچے عمر کے چوتھے سال میں شامل ہونا شروع کرتے ہیں، مل جل کر کھیلے جانے والے کھیلوں کے ذریعہ بچہ کی معلومات و تجربات میں اضافہ ہوتا ہے، وہ سیکھتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ معاملات کیسے کیے جاتے ہیں، اس کے سامنے نئی دنیا ہوتی ہے، وہ نہ صرف یہ سیکھتا ہے کہ کیسے کھیلا جائے بلکہ وہ اپنا کردار ادا کرنے کا طریقہ سیکھتا ہے، نئے تصورات و تخیلات سے آشنا ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ اپنی شخصیت اور اپنے خیالات کو بیان کرنے میں یہ اجتماعی کھیل اس کی بڑی حوصلہ افزائی کرتا ہے، لیکن دوسروں کے ساتھ کھیلنے میں ایک مسئلہ کبھی کبھی یہ بھی پیش آتا ہے کہ بچے کی امیدیں ٹوٹتی ہیں، غلبہ اور کنٹرول کی خاطر جھگڑا ہوتا ہے، اور کبھی کبھی تو بچہ شدید تاثر و احساس سے دوچار ہوتا ہے، دراصل عمر کے اس مرحلہ میں عام طور پر بچے کے اندر انانیت اور اپنی شخصیت کو ترجیح دینے اور مقدم رکھنے کی عادت ہوتی ہے، ایسا وہ اس لیے نہیں کرتا کہ وہ اسی کو پسند کرتا ہے اور دوسروں کی بالکل پروا نہیں کرتا، بلکہ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ اب تک اس کو اپنی شخصیت کی حفاظت اور زندگی گزارنے کے دوسرے طریقوں کا

علم ہی نہیں ہوسکا ہے، وہ دنیا کو صرف اپنی نظر، اپنے مقام اور اپنے جذبات وخواہشات کے مطابق دیکھتا ہے، اس کو اس کی تمیز نہیں ہوتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ رہنے اور کھیلنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس طرح ان سے کچھ لیا جائے اسی طرح ان کو دینے کا بھی جذبہ رکھا جائے۔

اس تفصیل کی روشنی میں مناسب یہ ہے کہ والدین دوسروں کے ساتھ کھیلنے پر بچے کی حوصلہ افزائی کریں اور اس کے مواقع فراہم کریں، اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود والدین کے اچھے تعلقات کچھ لوگوں سے ایسے ہوں، جن کے بچے بھی اپنے بچوں کے ہم عمر ہوں، اس طرح جب وہ ایک دوسرے کی ملاقات کو جائیں گے تو فطری طور پر بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملنے اور کھیلنے کا موقع ملے گا۔

یہ بھی ایک فطری معاملہ ہے کہ جب بچے ایک ساتھ کھیلیں گے تو ان کے درمیان کچھ نہ کچھ اختلاف ہوگا، جھگڑے ہوں گے، والدین کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ بچوں کے اختلافات کو نمٹانے کی جلدی نہ کریں، ان کے بہت جلدی مداخلت کرنے سے ایک اہم مقصد فوت ہوجائے گا، دراصل یہ بھی بچوں کی اہم ضرورت ہے کہ بچے خود ہی اپنے اختلافات کو حل کرنا سیکھیں، حل کرنے کے طریقے انھیں معلوم ہوسکیں، ان کو ضرورت ہوتی ہے کہ امید کے خلاف نتیجہ آنے، اختلاف رونما ہونے، اور غصہ کی حالت میں ہونے کے وقت اپنے احساسات اور دوسروں کے احساسات کا تجربہ کریں، ظاہر ہے کہ یہی چیز آئندہ زندگی میں پیش آئے گی، اس لیے والدین کی عدم مداخلت یا مداخلت کے لئے عجلت نہ کرنے کا طریقہ آئندہ زندگی سے زیادہ قریب تر اور اس کے لیے زیادہ مفید ہے۔

البتہ آپ کسی بچے کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مظلوم ہوتا ہے، اس کا حق مار دیا جاتا، اسے کھیلنے کا مناسب وقت اس کی باری پر نہیں دیا جاتا، اور کوئی بچہ ہمیشہ معاملات پر غالب رہتا ہے بلکہ اپنی مرضی دوسروں پر بھی تھوپتا ہے، اسی طرح کوئی بچہ ہمیشہ دوسروں کے معاملہ میں بہت سختی اور شدت برتتا ہے، ایسے موقع پر آپ مداخلت کر سکتے ہیں تاکہ ان کے درمیان عدل و مساوات قائم کیا جا سکے، ان کو دوسروں کے احساسات و خواہشات کا احترام کرنے کی تعلیم دی جا سکے، لیکن اس موقع پر آپ کا پرعزم اور شفاف وغیر جانبدار ہونا ضروری ہے، آپ کو اس کا اظہار کرنا ضروری ہے کہ آپ کسی کی طرف جھکاؤ نہیں رکھتے بلکہ آپ کی توجہ صرف نفسِ موضوع پر ہے، یہ چیز آپ کے لیے اس وقت اور اہم ہوجاتی ہے جبکہ معاملہ میں خود آپ کا بچہ بھی شامل ہو، اگر کھیل ایسا ہے کہ ہر بچے کو اپنی باری کا انتظار کرنا ہے، تو کوشش کیجئے کہ ان میں سے ہر بچہ انتظار کرے اور دوسرے کی باری یا دوسرے کے رول کو استعمال نہ کر سکے، اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ بچے کو انتظار کے بعد اس کی باری یا اس کا حصہ ضرور ملے، ورنہ اس کے اندر انتظار کے متعلق منفی سوچ پیدا ہوگی، وہ سوچے گا کہ انتظار کوئی اچھی چیز نہیں اور نہ ہی نفع بخش ہے، گویا اس نے انتظار کر کے موقع گنوا دیا، اگر یہ سوچ پیدا ہوگئی تو وہ دوسروں کی باری اور دوسروں کے حصہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور بار بار کرے گا، بچپن کے یہ مسائل و مواقف اس حیثیت سے اہم ہوتے ہیں، کیوں کہ بچپن میں جو موقف بن جاتا ہے اسی کو بڑے ہوکر ہم اپنی زندگی میں دوسروں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

☆☆☆

❑ اصلاح احوال

موجودہ مسلم معاشرے کا منظرنامہ

ابونصر فاروق

آج کا آدمی بے چین ہے، فکرمند ہے، پریشان ہے اور بلڈ پریشر کا مریض ہے۔ زندگی ایسی بے یقینی کی کیفیت سے گزر رہی ہے کہ یہ آدمی کسی پر بھروسہ اور اعتماد نہیں کر سکتا ہے۔ خاندان، معاشرہ، سوسائٹی اور دوست احباب سب خود غرضی کا شکار ہیں۔ ایثار وقربانی تو بہت دور کی بات ہے کوئی درد وغم بانٹنے والا بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کل جب جوانی ساتھ چھوڑ دے گی، جسم کمزور ہو جائے گا، کام کرنے کے قابل نہیں رہے گا، بیماری دبوچ لے گی، علاج میں بہت زیادہ روپیوں کی ضرورت ہوگی تو اس وقت اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ صحت مندی کی حالت میں جتنا زیادہ سے زیادہ کما کر جمع کر لیا جائے وہی آنے والے برے وقت میں کام آئے گا۔ جب کما کر دولت جمع کرنی ہے تو پھر حلال اور حرام کی فکر بے کار ہے۔ حلال پر قناعت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دولت سے منہ موڑ لینا ہوگا، اور ان حالات میں ایسا کرنا صریح نادانی ہے۔

بچوں کا مستقبل تابناک اور روشن بنانے کے لئے اعلیٰ تعلیم گاہوں میں مہنگی تعلیم دلانے کے لئے ڈھیر ساری دولت کی ضرورت ہے۔ پھر اچھے میڈیکل یا انجینیرنگ کالج میں داخلے کے لئے بھی بہت سے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ بیٹی کی شادی کے لئے اچھا لڑکا آسانی سے نہیں ملے گا۔ اچھا لڑکا اونچی قیمت پر خریدنا ہوگا۔ اس کے علاوہ شادی کا خرچ دس سے بیس لاکھ تک ہوگا۔ تنی رقم کہاں سے آئے گی۔

کرایے کے مکان میں کب تک زندگی گزرے گی۔ اپنا مکان ہونا چاہئے۔ اچھے علاقے میں زمین کا معقول حصہ کروڑوں میں خریدنا ہوگا، پھر مکان بنانے میں بھی کروڑوں خرچ ہوں گے۔ یہ رقم کہاں سے آئے گی۔ پریم چند کے الفاظ میں ماہانہ تنخواہ تو دوج کا چاند ہے جو مہینے میں صرف ایک بار دکھائی دیتا ہے۔ باقی مہینے کی اندھیری راتیں اس کے سہارے کیسے گزریں گی۔ ان کے لئے تو روشنی کا انتظام الگ سے کرنا ہوگا۔ ایسے حالات میں جائز ناجائز، صحیح غلط، ظلم وزیادتی اور عدل وانصاف کے ترازو سے انسانی سرگرمیوں کو تولنا حماقت اور بے وقوفی ہے۔ اور جب بہتی گنگا میں سارا سماج اپنے ہاتھ دھو رہا ہے تو ہم کون سے پارسا پرہیزگار ہیں کہ اس سے الگ رہیں گے۔ عقل مندی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت کما کر جمع کی جائے اور آنے والے مستقبل کا انتظام کر لیا جائے۔

آج کے انسانوں کے ساتھ مسلمانوں کی بھی یہی سوچ ہے، جس کے تحت ان کی زندگی گزر رہی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم میں اب کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں شرٹ

پینٹ اور کرتا پاجامہ پہنتے ہیں۔لباس کا فرق دونوں کے بیچ نہیں رہا جس سے وہ پہچانے جائیں۔کھانے کے معاملے میں غیر مسلم بھی اب بغیر چکن مٹن اور مچھلی کے کھانا نہیں کھاتے۔مسلمانوں کی شادیوں میں ویجیٹیرین کھانے یعنی پوری اور سبزی ضرور پکتی ہے۔اسی طرح غیر مسلموں کی شادیوں میں چکن مٹن اور پلاؤ بھی ضرور بنتا ہے۔چونکہ شادی ہال میں شادی ہوتی ہے اس لئے سجاوٹ اور تام جھام سے بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلم کی شادی ہے یا غیر مسلم کی۔مکان بھی دونوں فرقوں کے ایک ہی طرح کے بننے لگے ہیں۔مکان کے باہر اگر ماشاء اللہ یا بسم اللہ لکھا ہوا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کا مکان ہے۔غیر مسلم کے مکان پر ہندی میں کوئی اشلوک لکھا ہو یا اوم یا سواستک کا نشان بنا ہو تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ غیر مسلم کا مکان ہے۔اس کے علاوہ مکانوں میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔تعلیم کا بھی یہی حال ہے۔خوش حال مسلمان مہنگے انگلش میڈیم اسکولوں میں اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں اسی طرح خوش حال غیر مسلم بھی ایسے ہی اسکولوں میں اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔غیر مسلم طالب علم اردو نہیں پڑھتا لکھتا ہے، مسلم طالب علم بھی اب اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا ہے۔تعلیم کا یہ فرق بھی دونوں میں ختم ہو گیا۔

مسلم معاشرے میں مسلکی گروہ بندی اتنے عروج پر ہے کہ مسجدوں اور مدرسوں کا بھی بٹوارا ہو چکا ہے۔اب نہ مسجدیں اللہ کا گھر رہیں اور نہ مدرسے دینی تعلیم کا مرکز رہے۔بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کے تین خانوں میں ملت اس طرح تقسیم ہو چکی ہے کہ تینوں طرح کے مسلمان ایک دوسرے کی مسجد میں نماز پڑھنا نہیں چاہتے۔کسی بھی مسلک کی مسجد میں اگر امام موجود نہ ہو اور کوئی ایسا نمازی موجود ہو جو امامت کر سکتا ہو تو اس کو امامت کرنے کی اجازت نہیں ملے گی کیونکہ وہ دوسرے مسلک کا مسلمان ہے۔یعنی امامت کے لئے اب تقویٰ، علم اور اخلاق و کردار معیار نہیں رہا بلکہ مسلک بنیاد بن چکا ہے۔شہر کے لوگ اپنے بچوں کو مدرسوں میں نہیں پڑھاتے۔قصبے اور دیہات میں رہنے والے ایسے مسلمان جو مذہبی سوچ رکھتے ہیں وہ اپنے بچوں کو مدرسے میں پڑھنے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔یا پھر وہ لوگ جو تعلیم پر رقم خرچ نہیں کر سکتے یا نہیں کرنا چاہتے وہ مدرسوں میں اپنے بچوں کو بھیج دیتے ہیں۔

گویا کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، گھر بنانے اور پڑھنے لکھنے میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں رہا۔دونوں کی زندگی ایک ہی طرح کی ہو چکی ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سب کچھ ایک ہی جیسا ہے تو پھر دونوں فرقوں میں لڑائی کیوں ہوتی ہے۔اور فسادات کیوں ہوتے ہیں؟

ہوتا یہ ہے کہ جب حکومت فتویٰ یا کسی شرعی قانون کے خلاف قانون بنانا چاہتی ہے تو عام مسلمان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی ہے، کیونکہ اس کو نہ دین سے مطلب ہے نہ شریعت سے۔مسلم مذہبی تنظیمیں اس کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں اور مسلمانوں کو آمادہ کرتی ہیں کہ اس کے خلاف احتجاج کرنا ہے، اور ملی اتحاد کا ثبوت دینا ہے۔پھر بیانات شائع ہوتے ہیں، پوسٹرس لگائے جاتے ہیں اور چھوٹے بڑے جلسوں کا دور شروع ہوتا ہے۔یہ سب چیزیں گویا جہاد کا درجہ رکھتی ہیں۔بے دین بد عقیدہ مسلمان اپنی مذہبیت کا بھرم رکھنے کے لئے دل کھول کر ایسے پروگراموں میں چندہ بھی دیتے ہیں اور پوری قوت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے جلسوں میں شریک بھی ہوتے ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کوششوں کا ساتھ نہیں دیا گیا

تو مسلم ملت کے اتحاد و اتفاق کا بھرم ختم ہو جائے گا۔ ان جلسوں کی حیثیت گویا عید کی سی ہوتی ہے۔ عید کے آنے سے پہلے عید کی تیاریاں خوب زور و شور سے ہوتی رہتی ہیں اور عید کے رخصت ہوتے ہی پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جلسہ ختم ہوتے ہی ساری امنگوں پر اوس پڑ جاتا ہے اور جلسے کا مقصد بھی کسی کو یاد نہیں رہتا۔ جلوس اور جلسے میں کی جانے والی دھواں دھار تقریروں کا شریک ہونے والوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

جب جلوس نکلتا ہے تو مسلم دشمن فرقہ پرست عناصر اس کا فائدہ اٹھا کر کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں کہ اس وقت جوش و جذبہ میں بھرے ہوئے مسلم نوجوان جوابی کارروائی کر بیٹھتے ہیں اور مسلم دشمن فرقہ پرست عناصر کو مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ پھر پولیس اور انتظامیہ بھی مسلمانوں کا نہیں فرقہ پرست عناصر کا ساتھ دیتی ہے۔ اس تمام عملی سرگرمی کے نتیجے میں فائدہ کچھ نہیں ہوتا، بلا ضرورت نقصان حد سے زیادہ ہوتا ہے۔

اکثر مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں تحریکیں چلتی رہتی ہیں۔ کسی پڑھے لکھے یا ان پڑھ مسلمان سے پوچھئے کہ مسلم پرسنل لا کس چڑیا کا نام ہے، تو وہ کچھ بھی نہیں بتا پائے گا۔ ایسا اس لئے ہے کہ نہ اس کو شریعت معلوم ہے نہ دین سے اس کا رشتہ ہے نہ وہ یہ جانتا ہے کہ مسلم پرسنل لا کیا چیز ہے۔ وہ تو صرف اس تنظیم کی پکار پر دیوانہ وار دوڑ پڑتا ہے جس سے وہ جڑا ہوا ہے۔

کوئی بھی مذہبی جماعت اپنے ماننے والوں کو اصلی اور حقیقی دین کی تعلیم، جس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے، دینے کی روادار نہیں ہے۔ وہ یا تو اپنے ماننے والوں کو اپنے مسلک کا مجاہد بنا رہی ہے یا وہ جو پروگرام چلا رہی ہے اس کا رضا کار بنا رہی ہے۔ اس پورے منظر نامے کو دیکھ کر وہ مٹھی بھر لوگ جو دین مبین کو عوام میں فروغ دینے اور مسلمانوں کو حقیقی مومن بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، ان کو ان مذہبی تنظیموں یا مذہبی شخصیتوں سے تعاون نہیں ملتا ہے بلکہ ان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کیونکہ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ مسلم عوام دین و شریعت سے واقف ہو سکیں۔ یہ ڈرتے ہیں کہ اگر مسلم عوام دین و شریعت سے واقف اور آگاہ ہو گئے تو پھر دین و شریعت کے نام پر ان کی جو بے راہ روی اور کج روی ہے اس کا پول کھل جائے گا اور ان کے حلوے مانڈے پر آفت آ جائے گی۔ جب رہبر ہی رہزن بن جائے تو ایسے قافلے کو لٹنے سے کون بچا سکتا ہے۔

کاش اس دور کے مسلمانوں کو قرآن کی یہ آیتیں پڑھنے اور سمجھنے اور پھر ان پر عمل کرنے کی توفیق ہو:

ان (بے دین لوگوں) کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکار حق ہی کی حالت میں دیں۔'' (سورہ توبہ:55)

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے (اللہ کی فرماں برداری سے) غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم قبر کے کنارے تک پہنچ جاتے ہو۔ (سورہ تکاثر)

تباہی ہے ہر اس شخص کے لئے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا عادی ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا؟ ہرگز نہیں۔ وہ شخص تو چکنا چور

کردینے والی جگہ (جہنم) میں پھینک دیا جائے گا۔(سورہ ہمزہ)

مذکورہ بالا آیتوں میں جس طرح کے لوگوں کا ذکر کیا جارہا ہے آج کے مسلم معاشرے کے مسلمانوں میں بڑی تعداد ایسی ہی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نگاہ میں کیسے لوگ مسلمان یا مومن ہیں ان کی تصویر ان آیتوں میں دیکھئے:

جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا، اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔'' (سورہ طلاق:3/2)

اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے، یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ نہیں۔ (سورہ الرعد:26)

اے نبی ﷺ، بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہی ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (الحج:35/34)

جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے، اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو بیہودہ چالبازیاں کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود غارت ہونے والا ہے۔ (فاطر:10)

سچے مسلمان اور مومن رزق اور روزی کے معاملے صرف دنیاوی تدبیروں پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ بہترین دنیاوی تدبیریں کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرتے ہوئے اس کی رحمت، تائید غیبی اور توفیق الٰہی کے طلبگار رہتے ہیں۔ تدبیر اور کوشش کے باوجود اگر ان کی آمدنی بڑھ نہیں پاتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی اللہ کا فیصلہ ان کے حق میں قدرے قلیل کا ہی ہے اس لئے جو قسمت کا لکھا نصیب ہو رہا ہے اس پر قناعت کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا ہے۔ ان پر جو آزمائشیں آتی ہیں ان پر صبر کرتے ہوئے یعنی مردانگی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے ہوئے، اللہ کی خوشنودی کے لئے روتے گڑگڑاتے ہوئے نمازیں ادا کرتے رہتے ہیں اور اس تنگ دستی میں بھی اپنے سے زیادہ نادار اور محتاج لوگوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ اللہ کے یہ نیک بندے دنیا کی لالچ اور ہوس میں مبتلا نہیں ہوتے اور دکھاوے اور ظاہرداری کے لئے تکبر اور غرور کا شکار نہیں ہوتے۔ متاع دنیا کی خاطر بیہودہ چالبازیاں نہیں کرتے یا کسی مکر اور چالبازی کے ذریعے اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دیتے۔ جب کہیں یہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو اللہ کا تقویٰ ان کے دلوں میں خوف وخشیت پیدا کردیتا ہے۔

(بشکریہ سہ روزہ دعوت، ۱۰ جولائی ۲۰۱۸ء معمولی تصرف کے ساتھ)

☆☆☆

❑ انکار حدیث

منکر حدیث ابوریّہ کے اعتراضات

محمد فرید حبیب ندوی

منکر حدیث ابوریّہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی شان میں طنز و تعریض کے خوب تیر ونشتر چلائے ہیں اور ان کی شان میں بڑی گستاخیاں کی ہیں، ذیل میں ہم اس کے اعتراضات پیش کر کے ان کے جوابات عرض کرتے ہیں:

۱۔ حضرت ابوھریرہؓ کے نام میں اختلاف: ابوریہ لکھتے ہیں: ''جتنا اختلاف حضرت ابو ہریرہؓ کے نام میں ہے، اتنا کسی صحابی کے نام میں نہیں، ان کے نام کے سلسلے میں تقریباً تیس اور بعض کے نزدیک ۴۴/اقوال ہیں''۔

یہ کہہ کر گویا وہ حضرت ابو ہریرہؓ کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن:

۱۔ کسی کے نام میں اختلاف ہونے سے اس کی عظمت میں فرق نہیں آجاتا، کیا انھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عظمت کا دارومدار نام ولقب پر نہیں رکھا۔

۲۔ اور بھی بہت سے صحابہ کرام کے ناموں میں اختلاف ہے، مگر اس سے ان کی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے نام میں اختلاف کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ جب سے اسلام لائے، اپنے اسی نام سے مشہور ہوگئے، اس لیے ان کے اصلی نام پر پردہ پڑ گیا، آج کتنے لوگ ہیں، جو حضرت ابوبکرؓ کے اصلی نام سے واقف ہوں گے، بھلا کیا اس سے ان کی عظمت میں کوئی کمی آ گئی۔

۴۔ اس سلسلے میں جو ۳۰/۴۰/اقوال بیان کیے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرا سی تحریف کی وجہ سے ایک ایک نام کو کئی شمار کرلیا گیا ہے، جیسے سعد اور سعید ایک ہی نام تھے، مگر ''ی'' کی کمی یا بیشی سے دو ہوگئے، اسی طرح دیگر ناموں کا حال ہے، ورنہ ابن حجرؒ کے بقول: ''وہ دس سے زیادہ نہیں، اور اگر مزید تحقیق سے کام لیا جائے تو صرف تین نام باقی رہ جاتے ہیں: عمر، عبداللہ اور عبدالرحمٰن''۔

۲۔ اسلام سے ماقبل کے حالات اور نسب کی تفصیلات کا علم نہ ہونا: ابوریہ کہتے ہیں: ''حضرت ابو ہریرہؓ کے بچپن کی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں، اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی بس اتنا معلوم ہے کہ وہ قبیلۂ دوس کی ایک شاخ ''ازد'' سے تعلق رکھتے تھے''۔

مگر یہ بتایا جائے کہ:

۱۔ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے، جس کا عربی قبائل میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام تھا۔

۲۔ دور جاہلیت میں عرب گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے، باہر کی دنیا سے ان کے روابط بہت کم تھے، اس لیے اس دور کی معلومات بہت کم ملتی ہیں، یہ سلسلہ تو اسلام کے بعد شروع ہوا، اور اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہؓ کا جو حال ہے وہی دیگر صحابہ کا بھی ہے، حجۃ الوداع میں سوا لاکھ صحابہ موجود تھے، کیا ابوریہ ان میں سے چند کے سوا تمام صحابہ کے تفصیلی حالات بتا سکتے ہیں؟

۳۔ اور جب اس سے دیگر صحابہ کی شان میں کچھ کمی نہیں

آئی، تو ابو ہریرہؓ کی شان میں کیوں کر آسکتی ہے؟ پھر یہ کس آیت سے ثابت ہے کہ جس کی قبل از اسلام تاریخ معلوم نہ ہو، اسے بے وقعت سمجھنا چاہئے؟

۳۔ ناخواندگی :

ابوریہ کہتے ہیں: ''حضرت ابو ہریرہ ناخواندہ تھے، لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے''۔

کسی صحابی کا امی ہونا کسی بھی دور میں قابل طعن نہیں رہا، یہ ان کی نئی اپج ہے، پھر ذرا بتایئے کہ سوا لاکھ صحابہ کرام میں کتنے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے؟ چند کے سوا سب ہی تو امی تھے، پھر حضرت ابو ہریرہؓ کی تخصیص چہ معنی دارد؟

٤۔ فقروفاقہ :

ابوریہ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ حضرت ابو ہریرہؓ کا تذکرہ بڑی حقارت سے کیا ہے، اس نے کہا ہے کہ'' وہ تہی دست تھے، اور رسول اللہ ﷺ کے در دولت پر اس لیے پڑے رہتے تھے تاکہ دو وقت کی روٹی میسر آسکے، ان کی قبیلہ میں کوئی عزت نہ تھی''، وغیرہ۔

فقراء کو حقیر سمجھنا اور ان کی بے توقیری کرنا تو کفار و معاندین کا رویہ رہا ہے، بے ایمان و بے توفیق لوگ ہی ہمیشہ فقراء مؤمنین کا مذاق اڑاتے آئے ہیں، مگر اسلام میں تو یہ چیز کبھی بھی قابل حقارت نہیں رہی؛ بلکہ انبیاء پر ایمان لانے والے اور خاص کر حضور ﷺ پر اول اول ایمان لانے والے فقراء ہی تھے، اس لیے ابوریہ کی یہ روش اور ذہنیت کفار کی روش سے میل کھاتی ہے، ورنہ اسلامی تاریخ میں ان فقراء کے جو کارنامے ہیں، دنیا اس سے واقف ہے، فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے کعبہ کی چھت سے اذان دینے کے لیے بڑے بڑوں کی موجودگی میں جس کا انتخاب کیا، وہ حضرت بلالؓ تھے، اسی طرح حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ وصہیبؓ وغیرہم کو بہت سے بڑے بڑے صحابہ پر فضیلت دیتے تھے۔ لہذا اس لیے اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں۔

۵۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اسلام : ابوریہ نے حضرت ابو ہریرہؓ پر یہ الزام لگایا ہے کہ'' وہ صادق الاسلام نہ تھے، اور انھوں نے حضور ﷺ کی صحبت اس لیے اختیار کی تھی تاکہ وہاں اچھی طرح شکم سیری کے مواقع مل سکیں''۔

پہلی بات یہ عرض ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے اسلام لانے کے بارے میں دو روایات ملتی ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ وہ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع اسلام لائے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ اسلام تو کئی سال پہلے لا چکے تھے، البتہ انھوں نے (خیبر کی طرف) ہجرت ۷ھ میں کی۔

ہمارے نزدیک دوسری بات زیادہ راجح ہے، اس کی دو دلیلیں ہیں:

۱۔ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا ہے، اس میں ہے کہ وہ اسلام قبول کر نے کے بعد اپنی قوم ''دوس'' (جس کے ابو ہریرہؓ بھی ایک فرد تھے) کی طرف واپس ہوئے اور انھیں اسلام کی دعوت دی، تو ان کی دعوت پر صرف ان کی والدہ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے اسلام قبول کیا۔

یہ روایت صراحت کرتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ ہجرت خیبر سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔

۲۔ بخاری اور مسلم نے ذکر کیا ہے کہ خیبر کی تقسیم غنیمت کے موقع پر حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابان بن سعد کے درمیان تکرار ہوئی، حضرت ابان نے غنیمت میں سے اپنا حصہ مانگا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ان کو حصہ نہ دیجئے کیونکہ انھوں نے غزوہ احد میں نعمان بن مالک کو (کو ابن قوقل کے نام سے مشہور تھے) قتل کیا تھا۔

غزوۂ احد کے موقع پر ابان مسلمان نہ تھے، اس لیے انھوں نے ابن قوقل کو قتل کر دیا تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ ہجرت خیبر سے بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے، اور کئی ایک غزوات میں شریک ہو چکے تھے جبھی تو انھیں علم تھا کہ ابان بن سعد نے غزوۂ احد میں ابن قوقل کو قتل کیا تھا۔

ابن حجر نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے کہ وہ ۷ھ سے بہت پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔

اسلام لانے کے بعد وہ پوری طرح حضور اکرم ﷺ کے دامن فیض سے وابستہ ہوگئے، اب بس ان کی یہی خواہش رہ گئی کہ زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کرسکیں، چنانچہ وہ صفۂ نبوی میں داخل ہوگئے، وہ اس طرح صحبت نبوی میں رہنے لگے کہ سفر وحضر کسی بھی موقع پر آپ سے الگ نہ ہوتے، تاوفات رسول وہ اسی حالت میں رہے۔

ان کے سفر ہجرت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی خوشی خوشی مدینہ آئے تھے اور پھر وہاں سے خیبر پہنچے تھے، روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ راستے میں یہ شعر گنگناتے آرہے تھے:

یا لیلة من طولها وعنائها
علی أنها من دارة الکفر نجّت

ہائے کتنی طویل اور تکلیف دہ ہے یہ رات!
مگر اس نے مجھے دار کفر سے نجات دی ہے۔

اسی طرح ذکر کیا گیا ہے کہ راستے میں ان کا غلام بھاگ گیا، جب وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو وہ غلام بھی سامنے آگیا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ابو ہریرہ! یہ رہا تمہارا غلام''۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے (خوشی میں) عرض کیا: ''یہ اللہ کے لیے آزاد ہے''۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سچے عاشق رسول اور پیکر صدق واخلاص تھے، انھیں رسول اللہ ﷺ کی ملاقات سے اتنی خوشی ہوئی کہ اپنا غلام ہی آزاد کردیا۔

۶۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور صحبت رسول ﷺ:

ابو ریہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی فاقہ کشی کی داستان بڑے مزے لے لے کر بیان کی ہے اور آپ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی صحبت ورفاقت اسی لیے اختیار کی تھی تاکہ چین سے کھا پی سکیں اور پیٹ بھر کھانے کا نظم ہوسکے۔

اس سلسلے میں چند گذارشات پیش ہیں:

۱۔ فقر وفاقہ اور افلاس شرفاء کے یہاں کوئی عیب کی بات نہیں، ہاں دنی لوگوں کے نزدیک اس میں عار ہوسکتا ہے، جو صرف مال وجاہ کو ہی عزت وعظمت کا واحد معیار سمجھتے ہیں۔

۲۔ ابو ریہ کا یہ کہنا کہ ''ابو ہریرہؓ نے آپ ﷺ کی رفاقت شکم سیری کے لیے اختیار کی تھی'' بے حیائی اور بغض ونفرت کی علامت ہے۔

کیا حضرت ابو ہریرہؓ کے قبیلے میں سامان خورد ونوش کی کمی تھی کہ وہ کھانے پینے کے لیے مدینہ آتے؟ صرف کھانے اور پینے کے لیے تو گداگر بھی سکونت کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ کر دور دراز جگہ نہیں جاتے ہیں، وہ بھی مال جمع کرنے جاتے ہیں، جبکہ ابو ریہ خود تسلیم کرتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے مال جمع نہیں کیا، تو کیا اس کی نگاہ میں حضرت ابو ہریرہؓ گداگروں سے بھی کم درجہ ہوگئے؟

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی صحبت ورفاقت اختیار کرنے کے سلسلے میں ابو ریہ نے جو روایت پیش کی ہے، وہ اس طرح نہیں جیسی اس نے بیان کی بلکہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

"وکنت ألزم رسول اللہ ﷺ علی ملأ بطنی"

اور مسلم کے الفاظ یہ ہیں:

"کنت رجلاً مسکیناً أخدم رسول اللہ ﷺ علی مل ء بطنی"

اس میں صحبت اختیار کرنے کا ذکر ہی نہیں، بلکہ محض آپ کے ساتھ رہنے اور خدمت کرنے کا ذکر ہے۔ اور یہ بات بھی حضرت ابو ہریرہؓ نے اس پس منظر میں کہی ہے کہ اوروں کے مقابلے میں ابو ہریرہ کے کثیر الروایت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دیگر لوگ کام کاج میں مشغول رہتے تھے اور میں تو قوت لایموت پر بس آپ کے در پر پڑا رہتا تھا۔

۴۔ ابو ریہ نے "علی مل ء بطنی" کے مفہوم میں بھی ردو بدل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس نے بیان کیا ہے کہ ابن ہشام نے کہا ہے کہ "علی"، تعلیل کے لیے آتا ہے، اس معنی کے حساب سے حدیث کا مطلب نکلے گا کہ میں پیٹ بھرنے کے لیے پڑا رہتا تھا''۔

یہ محض افترا پردازی ہے، اس لیے کہ ابن ہشام نے تو یہ ذکر کیا ہے

کہ "علی" نومعانی کے لیے آتا ہے، ان میں ایک تعلیل بھی ہے، اب یہ بتایئے کہ ابوریہ نے نو میں سے محض تعلیل کے لیے ہی اسے کیوں متعین سمجھا؟ جب کہ اس میں دوسرے معانی کا بھی احتمال ہے۔

ابوریہ کے برعکس تمام ائمہ ومحدثین نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتا تھا، اس روزی روٹی پر جس سے پیٹ بھر جاتا یعنی قوت لایموت پر۔ نووی، ابن حجر اور عینی سب نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ابوریہ نے اپنے بغض وکینہ کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کے اسلام اور ان کی اللہ و رسول کی محبت میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بری طرح ناکام ہوا، کیوں کہ یہ واقعہ اور ان کا رسول اللہ ﷺ کی صحبت اختیار کرنا ان کی محبت کے سچی ہونے کی دلیل ہے، جس میں حب دنیا، مال کی خواہش اور جاہ پسندی کا کوئی شائبہ تک نہیں۔

اس لیے کہ اگر انہیں دنیا کی یا مال کی محبت ہوتی تو وہ مدینہ آکر بھی تجارت وزراعت کرتے اور مال کماتے؛ لیکن انھوں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا، بلکہ انھوں نے علم حدیث کی طلب کے لیے ان تمام چیزوں کو ٹھکرا دیا، اسی طرح اگر انھیں جاہ کی طلب ہوتی تو وہ صفہ کے مکین نہ بنتے، ان کا بھوک کی سختی کو برداشت کرنا اور صفۂ نبوی پر پڑے رہنا جاہ پسندی کے ہر شائبہ کو دور کر دیتا ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے انھیں بحرین کا گورنر بنایا تھا، ان کے پاس کچھ مال آیا، حضرت عمرؓ نے ان سے محاسبہ کیا، حساب بالکل ٹھیک نکلا، اس کے بعد آپ نے دوبارہ یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا، اگر وہ جاہ پسند ہوتے تو اتنا عظیم منصب کیوں کر ٹھکرا دیتے!!

۷۔ حضرت ابوھریرہؓ بسیار خور تھے:

ابوریہ نے لکھا ہے کہ "(الف) حضرت ابو ہریرہؓ بسیار خور تھے، (ب) روزانہ آنحضور ﷺ یا کسی صحابی کے گھر جا کر کھایا کرتے، (ج) حتی کہ بعض لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے"۔

جواب:

(الف): یہ بھی ایک تاریخی جھوٹ اور حقیقت کو بگاڑ کر پیش کرنے کی گھناؤنی مثال ہے:

اولاً تو حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں بسیار خوری کی بات کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

لیکن اگر اسے ثابت مان بھی لیا جائے تو اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کی صداقت و عدالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ دنیا کے کسی بھی مذہب میں زیادہ کھانے سے عدالت مجروح نہیں ہوتی ہے۔

(ب): اور جہاں تک حضرت ابو ہریرہؓ کے صحابہ کرام کے گھروں پر جانے کی بات ہے، تو ابوریہ نے اسے اس طرح پیش کیا ہے جیسے نعوذ باللہ وہ کوئی گداگر تھے، جو ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے، جس کا جی چاہتا انہیں دے دیتا اور جو چاہتا انھیں دھتکار دیتا، حالانکہ یہ واقعہ کی نہایت غلط تصویر کشی ہے، بات جو کچھ ہے وہ بس اتنی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ صفہ میں مقیم تھے، اور اصحاب صفہ حضور اکرم ﷺ کے مہمان ہوتے تھے، چنانچہ کوئی صحابی اگر وہاں کچھ لاکر دے دیتا تو آپ ﷺ کے ساتھ اسے کھانے میں دیگر اصحاب صفہ کی طرح حضرت ابو ہریرہؓ بھی شریک ہوتے، اور اگر کوئی آپ ﷺ کو دعوت دیتا تو آپ کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ (اور بعض دیگر اصحاب) بھی چلے جاتے۔

ابوریہ نے اپنی بات کو مؤکد کرنے کے لیے یہ روایت بھی پیش کی ہے کہ "حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روزانہ آمد و رفت کی وجہ سے ان سے فرمایا تھا: "زر غباً تزدد حباً" کہ تم لوگوں کے گھروں پر روزانہ نہ جایا کرو۔

حالانکہ یہ استدلال بالکل غلط ہے، اس لیے کہ اس حدیث کا پس منظر جیسا کہ خود ابوریہ نے بھی لکھا ہے یہ ہے کہ ایک دن آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: تم کل کہاں تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں اپنے گھر والوں سے ملاقات کے لیے گیا تھا، تو آپ نے فرمایا: "ناغہ کر کے میری زیارت کیا کرو"۔

اب خود سوچئے کہ ابوریہ نے اس حدیث سے جو استدلال کیا ہے اور اس کا جو پس منظر بیان کیا ہے، دونوں میں کتنا واضح تضاد

ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس حدیث کی صحت مشکوک ہے، حافظ سخاوی نے محدث عقیلی کے واسطے سے لکھا ہے کہ یہ ضعیف ہے، ابن حبان نے اسے عبید بن عمیر پر موقوف بتایا ہے۔ سخاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حدیث مختلف صحابہ سے مروی ہے اور ابن عدی نے یہ حدیث اپنی کتاب میں چودہ مقامات پر نقل کی ہے، مگر ان میں سے ایک بھی علت سے خالی نہیں، تاہم کثرت طرق سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔

بہر حال اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے یہ الفاظ خاص حضرت ابو ہریرہؓ سے کہے تھے، دس صحابہ نے اسے روایت کیا ہے، اب ابوریہ بتائے کہ کیا وہ سب کو گداگر کہنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

(ج): رہا ابوریہ کا یہ کہنا کہ بعض صحابہ کرام حضرت ابو ہریرہؓ سے نفرت کرنے لگے تھے، تو ہم اسے چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کسی ایک بھی صحیح روایت سے اسے ثابت کر کے دکھائے۔

حقیقت حال تو یہ ہے کہ تمام مسلمان حضرت ابو ہریرہؓ سے محبت اور ان کا احترام کرتے تھے۔

ابوریہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک قرآنی آیت یاد ہوتی اور وہ دانستہ کسی صحابی سے پوچھتے تا کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو اور انھیں کھانا کھلانے کے لیے اپنے ساتھ لے جائے، وہ حضرت جعفر کے ساتھ ایسا ہی کرتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ حضرت جعفر کو حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ، علیؓ و عثمانؓ اور دیگر کبار صحابہ پر فضیلت دیتے تھے''۔

اس الزام میں ابوریہ نے کذب وافترا اور تضلیل سے کام لیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کے الفاظ یہ ہیں ''إنی لأستقرئ الرجل''، ان سے حضرت ابو ہریرہؓ سامنے والے سے میزبانی طلب کیا کرتے، مگر سامنے والا اس سے یہ سمجھتا کہ وہ آیت کی قراءت دریافت کر رہے ہیں، جیسا کہ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے یہی بات کہی، تا کہ وہ انہیں کھانا کھلائیں، مگر حضرت عمرؓ اس کا یہی مفہوم سمجھے اور انہیں قرآن سنانا شروع کر دیا، ابو ہریرہؓ نے یہ سن کر کہا کہ میرا مقصد تو کھانا طلب کرنا تھا۔

جہاں تک حضرت جعفرؓ کی تعریف کی بات ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو (جن میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی ہوتے) اپنے گھر لے جاتے اور کھانا کھلاتے، حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ جعفرؓ مساکین کے حق میں سب سے بہتر ہیں، اور خود رسول اللہ ﷺ نے انہیں ابوالمساکین کا لقب دیا تھا، تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اگر تعریف کر دی تو کیا حرج؟

لیکن ایسا بالکل نہیں کہ وہ حضرت جعفرؓ کو تمام صحابہ سے افضل سمجھتے ہوں، وہ مسکینوں کے خیال رکھنے کے اعتبار سے انھیں افضل قرار دیتے تھے، نہ کہ عمومی اعتبار سے، جیسا کہ ابن حجر نے فتح الباری (۶۲/۷) میں صراحت کی ہے۔

۸۔ حضرت ابوہریرہ کھانوں کے شوقین تھے:

ابوریہ نے ثعالبی اور ہمدانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ابو ہریرہؓ مضیرہ کو بہت پسند کرتے تھے اور انہیں ''شیخ المضیرۃ'' کہا جاتا تھا''۔

بتایا جائے کہ کسی خاص قسم کے کھانے کو پسند کرنا کونسی بری بات ہے؟ خود آپ ﷺ کدو، پنڈلی کا گوشت اور ثرید کو پسند فرماتے تھے۔

ابوریہ نے اس ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ لذیذ کھانوں کے لئے حضرت معاویہؓ کے کیمپ میں جاتے اور نماز حضرت علیؓ کی پیچھے پڑھتے۔

یہ روایت بالکل غلط ہے، جو یا تو شیعہ کی کتب میں ملتی ہے یا ادب عربی کی کتابوں میں، جن میں صحیح وغلط ہر قسم کی روایات ہوتی ہیں، جب کہ یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ان مجادلات میں حصہ نہیں لیا تھا، بلکہ وہ سب سے کنارہ کش رہے تھے۔

اسی ضمن میں ابوریہ نے ''کتاب الحلیہ'' سے حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

''میرے پیٹ کو خدا غارت کرے، جب میں اسے سیر کرتا ہوں، تو مجھے تنگ کرتا ہے اور اگر بھوکا رکھتا ہوں، تو مجھے

برا کہتا ہے، یا کمزور کر دیتا ہے''۔

اولاً تو اس کتاب میں صحیح روایات کا التزام نہیں ہے، چنانچہ یہ قول بھی ضعیف ہے۔

ثانیاً یہ کوئی غلط بات نہیں، یہ بات تو ہر شکم پر صادق آتی ہے، یہ ہر پیٹ کی خاصیت ہے کہ شکم سیر ہونے پر مختلف چیزوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور بھوک کی وجہ سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

اسی ضمن میں ابوریہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ثعالبی نے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے ''میں نے روٹی کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو نہیں سونگھی اور کھجوروں پر لگائے گئے مکھن سے بہتر کوئی سوار نہیں دیکھا''۔

بالفرض اگر یہ بات صحیح بھی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس میں جرح والی کونسی بات ہے؟ یہ تو حضرت ابوہریرہؓ کی خوش مزاجی اور عمدہ ذوق کی دلیل ہے۔

۹۔ حضرت ابوھریرہؓ کی ظرافت ومزاح پسندی: ابوریہ نے دعوی کیا ہے کہ مؤرخین کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ تمسخر ومذاق کے عادی اور کثیر الکلام اور فضول گو تھے۔

یہ دعوی کہ حضرت ابوہریرہ کی بیہودہ گوئی پر مؤرخین کا اجماع ہے، افتراء پردازی کے سوا کچھ نہیں، ابوریہ اس سلسلے میں کوئی ایک روایت بھی پیش نہیں کرسکتا۔

رہا ابوریہ کا یہ کہنا کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو یاوہ گو کہا تھا، تو اس پر ہم احمد امین کی بحث میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے تو ان کے بارے میں کوئی بات کہی ہی نہ تھی، دراصل آپ پر تنقید تو قین اشجعی نے کی تھی، مگر اس نے بھی بیہودہ گو نہیں کہا تھا۔

اور اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ واقعۃً حضرت عائشہؓ نے ایسا کہا تھا، تو یہ فرد واحد کی بات ہوگی، ابوریہ نے جو مؤرخین کے اجماع کا دعوی کیا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ کیا حضرت عائشہؓ کی ذات میں سب مؤرخین جمع ہوگئے ہیں؟

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ ظریف اور مزاح پسند تھے، مگر یہ بتایا جائے کہ ظرافت اور مزاح عیب ہے؟ یا اسلام میں محبوب وپسندیدہ؟

خود رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سے مزاح فرماتے تھے، اور صحابہ ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے، اس میں خرابی کیا ہے؟

اب ہم ابوریہ کی علمی خیانت دکھانا چاہتے ہیں، اس نے یہ تو بیان کردیا کہ حضرت ابوہریرہؓ کے مزاح پر مؤرخین کا اجماع ہے، اور یقیناً ایسا ہی ہے، مگر مؤرخین کا اس بات پر بھی تو اجماع ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ باوجود اپنی زندہ دلی اور ظرافت کے، صادق القول، حافظ حدیث اور عابد وزاہد تھے۔ ابوریہ نے ان کے اس اجماع سے کیوں کر اغماض برتا؟

اسی ضمن میں ابوریہ نے ''الحلیہ'' کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ''حضرت ابوہریرہؓ سفر میں تھے، ان کے رفقاء نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور کھانے کے لئے دسترخوان بچھایا، حضرت ابوہریرہؓ نماز میں مشغول تھے، انہیں بلایا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں روزے سے ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہوکر آئے اور کھانا کھانے لگے، لوگوں نے قاصد کو گھور کر دیکھا، تو اس نے کہا: بخدا ابوہریرہؓ نے کہا تھا کہ وہ روزے سے ہیں، یہ سن کر حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: ''یہ سچ کہتا ہے، میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص رمضان کے ساتھ ہر ماہ تین روزے رکھ لے تو یہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی طرح ہے، میں نے اس ماہ تین روزے رکھ لئے ہیں، اس لئے میں حقیقۃً تو روزے سے نہیں؛ لیکن ثواب کے اعتبار سے روزے سے ہوں''۔

ابوریہ نے اس واقعہ سے آپ پر عیب جوئی کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ ایک مزاح تھا، جو حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے رفقاء کے ساتھ کیا، اس سے ان کی ثقاہت کیسے ساقط ہوسکتی ہے؟ امام احمد نے مسند میں ذکر کیا ہے کہ اسی طرح کا واقعہ حضرت ابوذر کا بھی ہے، کہیں ابوریہ ان کو بھی ساقط الاعتبار نہ قرار دے دے۔

☆☆☆

❑ افکار ونظریات

حضرت مولانا علی میاںؒ اوران کی فقہی فکر

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (1914-1999) بیسویں صدی کی ایک ایسی شخصیت رہے ہیں جنھیں بجا طور پر بر صغیر کے لئے صدی کی اسلامی شخصیت قرار دیا جائے گا۔ گوکہ آپ کی علمی ودعوتی خدمات نے پورے عالم اور بالخصوص عالم عرب کے لئے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں، لیکن برصغیر کے لئے جہاں سے آپ کی وطنی وابستگی رہی ہے، جہاں کے مسائل سے آپ براہ راست متعلق اور متاثر ہوتے رہے ہیں، اور جہاں کے اہل زبان سے آپ نے مادری زبان میں اظہار خیال کیا ہے' اس جغرافیائی خطہ کی پوری صدی صحیح معنوں میں آپ کی صدی کہلانے کی مستحق ہے۔ اس کی متعدد وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ مولانا علی میاں علیہ الرحمہ کی شخصیت کا اعتدال اور خدمات کا تنوع ہے۔

شخصیت کے اعتدال کا مظہر یہ ہے کہ آپ نے اپنی ذات کو کسی چھوٹے سے خول میں محدود نہیں رکھا، بلکہ ہر قدیم نافع اور جدید صالح سے وابستگی اختیار فرمائی۔ چنانچہ برصغیر کی بیشتر جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کے ساتھ آپ کے علمی وفکری اور دعوتی روابط رہے، اور وہاں آپ نے اپنی فکر وخیال کے نقوش چھوڑے۔ ایک طرف تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، اہل حدیث اور اہل تصوف، تو دار العلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دوسری جانب۔ مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل اور امارت شرعیہ تیسری جانب۔ ان سارے اداروں اور مراکز کے ساتھ آپ کی گہری وابستگی رہی اور علمی وعملی اشتراک قائم رہا۔

خدمات کا تنوع اگر دیکھا جائے تو دعوت دین، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، پیام انسانیت، ادب اسلامی، بین مذاہبی اشتراک عمل، انتظام وانصرام، قیادت ورہنمائی، اصلاح وتزکیہ اور سیاسی بیداری جیسے متنوع میدانوں میں آپ نے کار نمایاں انجام دیئے۔ تاریخ سے آپ کو دلچسپی تھی تو دعوت واصلاح کی اسلامی تاریخ آپ نے بڑی تفصیل اور استناد کے ساتھ سنائی۔ سیرت وسوانح سے آپ کو تعلق خاطر تھا تو اسے پڑھا اور اس پر لکھا۔ فکری اصلاح اور رہنمائی آپ کی فکر غالب تھی تو عرب وعجم کو آپ نے تقریری اور تحریری خطابات کے ذریعہ جھنجھوڑا۔ قرآنیات آپ کا محبوب موضوع تھا تو اس پر اپنے تدبر اور تفکر کے نقوش پیش کئے۔ ادب سے آپ کو وابستگی تھی تو ادب اسلامی پر تحریری سرمایہ اکٹھا کر دیا۔

غرض اعتدال فکر اور تنوع عمل کی یہ دو صفات مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کو امتیازی حیثیت عطا کرتی ہیں۔ اور اس بنا پر یہ شخصیت جس کے افکار وخدمات کا دورانیہ صدی کے اختتام تک

محیط ہے، صدی کی اسلامی شخصیت قرار پاتی ہے۔

مولانا علی میاںؒ کا خصوصی میدان فقہ وفتاوی نہ تھا، لیکن اپنے اسی اعتدال فکری اور تنوع عملی کے تحت آپ نے فقہی تصور وفکر کے تئیں بھی اظہار خیال کیا اور موقف اپنایا۔ آپ کی تحریروں میں اس کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

فقہی میدان میں مسلکی اختلاف کا موضوع برصغیر کے مذہبی حلقوں میں بڑا حساس رہا ہے۔ عمومی منظر نامہ اس بابت شدت وصلابت کا ہے۔ تعلیمی اداروں میں بھی مسلکی عصبیت اور شدت ہی درسی منہج قرار پایا ہے۔ فتاویٰ کے مراکز نے اسی کی پابندی اختیار کی ہے، اور تصنیف وتقریر کا بڑا حصہ اسی موضوع کی نذر ہوتا رہا ہے۔ اس صورت حال نے ملت کے اندر مصنوعی سرحدیں کھڑی کر دی ہیں، اور فاصلوں کی دیواریں اٹھا دی ہیں۔ علمی توانائی کا بڑا ذخیرہ اس پر صرف ہوا ہے۔ اور اس منہجی اور علمی رویئے نے امت کے اتحاد اور فکری ارتقا کے میدانوں میں متعدد دشواریوں کو جنم دیا اور رکاوٹیں پیدا کیں۔ مسلک کی خدمت دین کی خدمت کا حصہ ضرور تھا، لیکن مسلک کی تردید اور تغلیط ایسا نہ تھا۔ اس دوسرے رخ نے اس اعتدال فکری کو ختم کر دیا جو دین کا امتیاز ہے۔ اسی طرح مسلک کی تبلیغ بھی دین کی تبلیغ نہ تھی، لیکن اس رویئے نے بھی علمی روح کو مجروح اور اخوت دینی کو متاثر کیا۔ یہ رجحان عرصہ سے چلا آ رہا تھا، اور برصغیر کا علاقہ اس غیر صحت مندانہ رجحان میں زیادہ نمایاں تھا۔ ماضی قریب میں اس رجحان میں مزید شدت ہی آئی اور اس وجہ سے مسائل جس قدر حل ہوئے اتنی ہی پیچیدگی بھی بڑھتی گئی۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے دور میں اس فقہی شدت وعدم توازن کو محسوس کیا تھا، اور اپنی تحریروں میں شریعت کے اصل معتدل موقف کو پیش کیا تھا۔ حضرت مولانا علی میاںؒ جو اسی سلسلہ زریں سے وابستہ تھے، اپنی کتاب 'تاریخ دعوت وعزیمت' کی پانچویں جلد میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اسی امتیازی فکر پر لکھتے ہوئے پوری صورت حال کی عکاسی ایک چھوٹے سے جملہ میں یوں کرتے ہیں:

''مذاہب فقہیہ کے کچھ ایسے آہنی سانچے بن گئے تھے جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن تھا پھیلنا ممکن نہ تھا''۔ (صفحہ:141)

اپنی اس رائے کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا علی میاںؒ نے اس جگہ حاشیہ میں لکھا ہے:

''یعنی اس مذہب کو ترک کر کے دوسرے مذہب کو اختیار کر لینے، حنفیت سے شافعیت یا بالعکس، یا عمل بالحدیث کا مسلک اختیار کر لینے کی مثالیں ہر زمانہ میں ملیں گی، لیکن ایک ہی مذہب کے دائرہ میں رہ کر بعض مسائل میں جزئی طور پر عدول اور کسی دوسرے مذہب کو اختیار کر لینے یا کسی مسئلہ میں حدیث پر عمل کرنے کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ اس لئے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک ''تجزی تقلید'' صحیح نہیں ہے، یعنی کسی مذہب وامام کا مقلد کسی مسئلہ میں بھی دوسرے مذہب وامام کی تقلید اور اس کے مسئلہ پر عمل کرے تو وہ اپنے امام کی تقلید کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے''۔ (ص:141، حاشیہ:2)

مذاہب فقہیہ کے ان آہنی سانچوں کے نتائج سماج پر جس طرح مرتب ہو رہے تھے، ان کو بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

''اس طرز فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ مذاہب اربعہ کے درمیان خلیج روز بروز عمیق اور وسیع ہوتی چلی جا رہی تھی، ان پر عمل کرنے والوں کے درمیان اختلاف منافرت تک' اور بحث ومناظرہ بعض اوقات مجادلہ اور مقاتلہ تک پہونچ جاتا تھا'' (صفحہ:141)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے دور کے حالات پر مولانا علی میاںؒ کے یہ فکری اقتباسات موجودہ حالات پر بھی اسی طرح منطبق ہو رہے ہیں، اور آج بھی ویسی ہی صورت حال ہے۔ چنانچہ مولانا محمد سالم قاسمی، مہتمم دار العلوم دیوبند وقف نے اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی کے ایک اجلاس میں پیش کردہ اپنے خطاب میں فرمایا کہ:

''فقہا کا فقہی مذہب قابل تبلیغ نہیں ہوتا، صرف قابل ترجیح ہوتا ہے،،،، ان فقہی مذاہب کی دعوت دینے کا آپ کو حق نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ دعوت دئے جانے کا حق دار صرف دین ہے'' (دین اور فقہی مذاہب ومسالک، صفحہ 24، ایفا پبلی کیشنز، دہلی)

مولانا علی میاںؒ نے فقہی مسالک پر عمل کے تئیں اسی معتدل فکر کی تائید فرمائی جو شاہ ولی اللہؒ نے اختیار کی تھی۔ تقلید اور اجتہاد کے بارے میں شاہ صاحب کے متعدل نقطہ نظر کی تحسین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''شاہ صاحب نے اس بارے میں جو مسلک اختیار کیا اور اس کی جو تعبیر کی وہ روح شریعت سے قریب تر، قرن اول سے زیادہ ہم آہنگ، فطرت انسانی سے زیادہ مطابق اور عملی زندگی سے سازگار ہے''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد پنجم، صفحہ 147)

اس ضمن میں پائی جانے والی افراط وتفریط پر آپ نے علمی گرفت فرمائی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ کی رائے پر گفتگو کے ضمن میں یہ بتاتے ہوئے کہ ایک طرف کچھ لوگوں نے تقلید کو مطلق حرام قرار دے دیا تھا، اور ہر عامی کو براہ راست کتاب وسنت سے احکام حاصل کرنے کا مکلّف کرتے تھے آپ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بالکل ایک غیر عملی بات ہے اور اس کا ہر مسلمان کو مکلّف قرار دینا تکلیف مالا یطاق ہے''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد پنجم، صفحہ 147)

اسی طرح یہ بتاتے ہوئے کہ دوسری طرف ایک گروہ تقلید کو ہر مسلمان پر واجب اور اس کے تارک کو فاسق وضال مانتا تھا' آپ لکھتے ہیں کہ:

''تقلید عوام کو نفسانیت اور خود رائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار اور انارکی سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت ونظم پیدا کرنے اور احکام شریعت پر سہولت کے ساتھ عمل کرنے کا موقع دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے، لیکن انھوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دے دیا، اور اتنی شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو ایک مذہب فقہی اور مسئلہ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دے دیا''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد پنجم، صفحہ 147)

فقہی مسالک کے درمیان اعتدال اور سب کا احترام مولانا علی میاںؒ کی فکر وتحریر کا امتیاز ہے۔ اسی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کی جلدوں میں شخصیات کے انتخاب میں یہی فکر جھلکتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں امام احمد بن حنبل، امام عبد القادر جیلانی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی شخصیات کا انتخاب مصنف کی وسعت نظری اور اعتدال فکری کی دلیل ہے۔ آپ کی دیگر تحریروں میں بھی مسلکی تعصب یا تحزب نظر نہیں آتا ہے۔ تمام ائمہ کے تئیں یکساں احترام اور اعتراف خدمات آپ کی تحریروں کی شان ہے۔

اپنی ایک تحریر میں مولانا علی میاں پہلے مسالک اربعہ کی اہمیت وعظمت اور ان کے مہتم بالشان کردار کو نمایاں کرتے ہیں، پھر حقیقت پسندی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

''اس سے نہ سمجھنا چاہئے کہ ائمہ اربعہ کے زمانہ میں جو لوگ

تھے وہ ان ہی چاروں مسالک میں سے کسی ایک مسلک سے اس طرح وابستہ تھے کہ اس سے سرمو تجاوز کرنا وہ گناہ سمجھتے تھے، اور اس وقت کا مسلم معاشرہ ان ہی چاروں فقہی مسالک کے درمیان منقسم ہو کر رہ گیا تھا اور ہر مسلک کے لوگ اپنے اپنے پرچم تلے کھڑے تھے، اس کی شہادت ہمیں فقہ اور علم کی تاریخ سے نہیں ملتی اور نہ ہی یہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی زندگی اور انسانی مزاج وخصوصیات سے کسی طرح ہم آہنگ ہے، بلکہ کسی خاص مذہب ومسلک کی تقلید کچھ عرصہ اور وقفہ کے بعد ہونے لگی۔ اگر ہم اسلامی تاریخ کی تقویم کے لحاظ سے اس کی تحدید کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چوتھی صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب کہ یہ چاروں مسلک اپنی پختگی اور کمال کو پہونچ چکے تھے اور خاص خطوں اور علاقوں میں پھیل چکے تھے، سیاسی، انتظامی اور تربیتی عوامل ومحرکات نے اس میں اہم کردار ادا کیا اور جن علاقوں اور خطوں میں مسلمان بستے تھے وہاں کی زندگی کا بھی تقاضا تھا''۔ (اجتماعی اجتہاد، ص: 14۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، دہلی۔1999ء)

موجودہ دور میں اجتہاد کی ضرورت کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

''فقہ کا یہ ذخیرہ عرصہ سے صرف تاریخ بن کر رہ گیا ہے، جس سے ہمیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور کے مجتہدین کس طرح احکام ومسائل کا استنباط کیا کرتے تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن وقت کی گھڑی کو نہ تو اپنی جگہ روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو معطل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کو ماضی کی طرف واپس لوٹایا جا سکتا ہے، جبکہ اسلام ایسی قوموں اور معاشرہ کا دین ہے جو ان مسائل ومشکلات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ ان کا سامنا کرتا ہے''۔ (صفحہ:21)

مولانا علی میاںؒ نے اپنا عملی موقف بھی اسی معتدل اور توسع آمیز بنیاد پر قائم کیا، چنانچہ آپ کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اندر نہ صرف مختلف مسالک کے طلبہ کا یکساں استقبال ہوتا رہا، بلکہ فقہ شافعی اور فقہ مالکی کی کتابیں بھی مختلف جگہوں پر داخل درس رہیں۔ عمل بالحدیث کا رجحان بھی پوری فراخی کے ساتھ موجود رہا، اساتذہ دارالعلوم میں بھی مختلف مسالک فقہیہ سے وابستگی کا یہی خوشنما منظر قائم رہا۔

مولانا علی میاںؒ کی یہ فقہی فکر دراصل صحیح اسلامی فکر ہے۔ اسی فکر کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے پوری قوت واستناد کے ساتھ پیش کیا تھا، اور اس کی دلنشیں تصویر مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتابوں میں پیش فرمائی ہے۔ فقہی تصلب اور تحزب کی بڑھتی مشکلات اور اس سے پیدا ہونے والے سنگین غیر اسلامی نتائج آج کھلے عام ہمارے سامنے آرہے ہیں، اور امت مسلمہ کی نکبت وادبار میں روز بروز اضافہ کرتے جارہے ہیں۔ ہمارے سنجیدہ اور اولین علمی مآخذ پر نظر کے ساتھ ساتھ حالات کی نبض پر نظر رکھنے والے ارباب علم بھی فقہی تحزب اور بے جا شدت کی اس سنگینی کو محسوس کررہے ہیں اور ان کے قلم سے احساس کی کراہ نکل رہی ہے۔ وقت کا شدید تقاضا ہے کہ اس فکر ولی اللہی اور فکر ابوالحسن کو، جو دراصل فکر اسلامی ہے، پوری قوت سے عام کیا جائے۔ اور انتہائی ضروری ہے کہ طریقہ درس اور منہج تدریس میں مسلک کی ہر حال میں برتری اور دوسرے مسلک کی ہر حال میں تردید اور اس کی تغلیط کے طرز کو پوری طرح چھوڑ کر اعتدال فکر اور احترام مسلک کی روش اختیار کی جائے۔

☆☆☆

□ جدید شبہات

دین اور اسکی ضرورت

ڈاکٹر عتیق الرحمان قاسمی
شعبۂ دینیات (سنی)، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ

دین عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی معاملہ کرنا ہے، عربی میں ایک مقولہ ہے ''دَنَاهُمْ كما دانوا''، ہم نے ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جیسا کہ انہوں نے کیا تھا، قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔'ان الدین عند اللّٰہ الاسلام'۔ (بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے)۔

دین اسلام کی یا شریعت کی زبان میں اس نظامِ زندگی کو کہتے ہیں جس میں مرکزِ اطاعت خدا کی ذات ہو، یعنی ایک انسان اس دنیا میں جو کچھ کرے وہ خود اپنے ساتھ کرے یا کسی اپنے پرائے کے ساتھ وہ سب خدا کے حکم کے ماتحت ہو، حقیقت یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی جانوروں اور چوپایوں کی طرح الگ تھلگ زندگی بسر نہیں کرتا اور نہ ہی کرسکتا ہے، بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے پر فطرتاً مجبور ہے۔ اس بناء پر سینکڑوں ہزاروں قسم کے معاملات ہیں جو اسے پیش آتے ہیں، اور وہ انکے متعلق کسی ایک قطعی حکم کا خواہاں ہوتا ہے، انسانی معاشرہ کو فساد اور تباہی و بربادی سے بچانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس طرح کے معاملات میں ایک فرد کیلئے یا ایک جماعت اور گروہ کیلئے کوئی حکم ایسا ہونا چاہئے جس سے انسان کے جائز حقوق کی پامالی نہ ہو اور جس میں اسکے مفاد کو کسی دوسرے انسان کے مفاد پر قربان نہ کر دیا گیا ہو۔

انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت فطرتاً ذاتی، خاندانی یا قبائلی منفعت و مفاد کو مقدم رکھتا ہے، اسی لئے ہر گاہک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس چیز کا وہ سودا کر رہا ہے وہ اس کو کم سے کم قیمت پر مل جائے، اس وقت اسکے دماغ میں پھر یہ خیال بالکل نہیں ہوتا کہ بائع کو اس صورت میں نفع ہوگا یا نقصان؟ اسی کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انسان فطرتاً مفاد پرست ہوتا ہے۔ اسے اپنی منفعت کے پیچھے دوسرے کے نقصان کا مطلق خیال اور اپنی لذت کوشی کی خاطر دوسرے کی اذیت کا ذرا دھیان نہیں رہتا، انسان بسا اوقات ایسی مذموم حرکت کر بیٹھتا ہے، جو اسے مرتبۂ انسانیت سے گرا دیتی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہر معاملہ اور ہر برتاؤ میں اچھے برے دونوں پہلو ہوتے ہیں، مثلاً آپ کے پاس کوئی سائل آیا ہے وہ آپ سے کسی مالی امداد کا خواہاں ہے، آپ اس وقت اچانک کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے کہ سائل کے سوال کو پورا کر دینا چاہئے یا نہیں؟ بلکہ تھوڑی دیر کیلئے سوچنے لگتے ہیں کہ اگر اس سائل کا سوال پورا کر دیا گیا تو آپ کے پاس روپیہ پیسہ کم ہو جائے گا، پھر اس سائل کو دیکھ کر دوسرا سائل آئیگا اگر یہ سلسلہ اسی طرح دراز رہا تو اپنی ساری لُٹ دے چکنے پر بھی اربابِ احتیاج کی حاجت وضرورت پوری نہیں کرسکتا۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر انسانی معاشرہ میں نظم وضبط قائم رکھنے

اورایک انسان کودوسرے انسان پر بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ خوداپنے اوپرظلم کرنے سے باز رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسانی معاشرہ ایک قانون یادستور کا پابند ہو، پہلے زمانے میں شخصی حکومتیں ہوتی تھیں، اور پوری مملکت میں امن وامان کے قیام کادارومدارایک شخص کے اشارۂ جنبش پر ہوتا تھا۔آج کل دستوری وآئینی حکومت کا زمانہ ہے،عوام کے نمائندے خودایک آئین ودستور بناتے ہیں اورپھر اپنی ایک نمائندہ حکومت قائم کرکے اس آئین کی تنفیذ کا اختیاراس حکومت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسانی معاشرہ میں امن وامان اورسکون واطمینان کادارومداراس بات پر ہے کہ اس معاشرے کے تمام افرادکاایک مرکزِ اطاعت ہو، پھر یہ مرکز کوئی ایک شخص ہو کہ اسکے ہاتھ میں قانون نافذ کرنے کی طاقت ہو۔ان کے معاشرہ کے اطمینان وسکون اوراسکی عافیت وخوش حالی کا انحصار اس ایک قانون یادستور یااس معاہدہ پر ہے جس کوسب نے مان لیاہواورجس کی پابندی کا سب نے عہد کیاہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ واقعی ایک دستورآئین ومعاہدہ کی رسمی پابندی کااعلان انسانی معاشرہ کوحقیقی امن وعافیت کی وہ نعمت وراحت بخش دیتا ہے جس کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔

آج مجلسِ اقوامِ متحدہ کے ماتحت پوری دنیا ایک مشترکہ دستور کے رشتہ سے بندھی ہوئی ہے لیکن اسکے باوجود پوری انسانی آبادی معلوم ہوتاہے کہ آتش فشاں پہاڑ پربیٹھی ہے اورکوئی نہیں کہہ سکتاہے کہ کب یہ پہاڑ پھٹ پڑے گا، اورآدم وحوا کے بیٹوں اوربیٹیوں کو ہلاک وبربادی کے کس گڑھے میں گرادے گا؟اربابِ جاہ وثروت عشرت وراحت کی خود فراموشیوں میں اپناغم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں،لیکن کرۂ ارضی کے اوپر بسنے والے ایک ایک انسان کادل چیرکردیکھواسکی تہہ میں غم واضطراب اورتشویش وفکرمندی کی دبی ہوئی لہریں ملیں گی۔آج کادن اگرخیریت سے گزرگیا تونہیں جانتا کہ کل کیاہوگا؟لیکن وہ اب فتوحات پر نازاں نہیں بلکہ خودپشیمان ہے، کیونکہ جن چیزوں کواسکی عظمت ونعمت کا سب سے بڑانشان ہوناچاہئے تھاوہی اب اسکی زندگی ،اس کی حیاتِ قوی،اسکی تہذیب وتمدن اوراس کے ملک کیلئے سب سے بڑاخطرہ بن گئی ہیں اوران چیزوں کی ایجاد واختراع میں اب اس کا قدم ایک ایسی منزل میں پہونچ گیا ہے کہ وہ پیچھے بھی نہیں لوٹ سکتا، پھر یہ بھی دیکھو کہ ان سب قوموں نے جس معاہدے پر دستخط کئے ہیں وہ انسانی حقوق کے جس چارٹر کی متفقہ طور پرحمایت کرتا ہے اسکی دفعات کیا ہے۔یہی کہ سب انسان برابر ہیں، کسی ایک قوم کودوسری قوم پرحملہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی، کسی ایک انسانی گروہ کواسکی آزادی نہیں ہوگی کہ وہ اپنی طاقت وقوت کا ناجائز استعمال کرکے دوسرے گروہ کے کلچر،تہذیب وتمدن اوراسکی قومی روایات کو پامال کرے،آخراسکی کیاوجہ ہے اگران کا تجزیہ کیاجائے توصاف معلوم ہوگا کہ اس ناکامی ونامرادی کا ایک ہی خاص سبب ہےاوروہ یہ کہ ان تمام معاہدہ کرنے والوں نے کسی اپنے سےاورسب سے بالاترہستی کے سامنےاپنے عہد وپیمان پر قائم رہنے اوراپنے قول میں صادق اورثابت قدم رہنے کا عہد نہیں کیا ہے، یہ سب معاہدے ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ یادنیا کی سب قوموں کے آپس میں متفقہ معاہدے ہیں ،جوکسی ڈریاخوف یاکسی منفعت ومفاد جو اس معاہدے کیلئے اصل بنیادکاحکم رکھتاتھا کسی ایک خاص قوم کےحق میں مضمحل ہوجاتاہے،تواس معاہدے کے شرائط ودفعات کی پابندی میں بھی خود بخود اضمحلال پیداہوجاتاہے، چنانچہ جولوگ زبان سے جمہوریت اورمساوات کانعرہ لگارہے ہیں ،ان کے ہاتھوں کودیکھوتوخون سے رنگین نظرآئیں گے،جو امن وامان اورصلح وآشتی کیلئے آج سب سے زیادہ بےقراراوراس کے سب

سے بڑے علمبردار ہیں، انکے اعمال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جنگ کی آگ بھڑکا دینا ان کے دل کی سب سے بڑی تمنا ہے۔

بہر حال عصبیت ایک چیز ہے جو بنی نوع انسانی کی وحدت میں رخنہ پیدا کرتی ہے، اور جو ایک ہی نوع کے افراد کو مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے، یہ بت جن کو ان قوموں نے اپنا امیرِ اطاعت قرار دیا ہے۔ خود انہیں کے ہاتھوں تراشیدہ اور انہیں کے ذہن وفکر کے آفریدہ ہیں اسلئے ظاہر ہے کہ ان کو اپنے کسی عمل پر نہ احتساب کا اندیشہ ہے اور نہ کسی فعل پر باز پرس کا خوف، مفاد پرستی ان کے عمل کا سب سے بڑا محرک، سب سے بڑا ضابطۂ زندگی اور سب سے زیادہ مؤثر آئینِ حیات ہے، اسلئے وہ اعلیٰ کیرکٹر اور وہ بلند کردار جو کسی اعلیٰ ترین قدرِ حیات کے ساتھ وابستہ ہونے سے ہی پیدا ہوسکتا ہے اسکی توقع ان سے کس طرح کی جاسکتی ہے۔ ایک شخص جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا ممکن ہے اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ کا حامل ہو۔ لیکن اسکے یہ اوصاف اور یہ اخلاق اسکی اپنی ایک خاص طبیعت یا تربیت کا نتیجہ ہونگے؟ اور ان کی بنیاد جذباتیت پر قائم ہوگی۔ اسکے برعکس جس شخص نے اپنے تمام جذبات وخواہشات کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا ہے۔ اسکے عمل کا محرک بہ نسبت پہلے شخص کے زیادہ قوی اور مؤثر ہوگا، اور یہ تو قاعدہ کلیہ ہے کہ محرک جس درجہ اور جس قوت کا ہوگا حرکت بھی اسی درجہ اور اسی قوت کی ہوگی۔

حضرت عمرؓ کی نسبت اپنے اور پرائے سب کو تسلیم ہے کہ ان کو اہل ملک کی خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم خبر گیری کا کسقدر غیر معمولی اہتمام ہوتا تھا؟ بیرونِ مدینہ کے حالات وہاں سے آنے والے لوگوں میں سے ایک ایک سے کرید کرید کر پوچھتے تھے اور مدینہ کی گلیوں اور کوچوں کا گشت خود شب میں کرتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح کے ایک موقع پر آپؓ کو کسی بچہ کی رونے کی آواز آئی۔ تو ماں سے جا کر کہا کہ بچے کو بہلائے کچھ دیر کے بعد پھر ادھر سے گذر ہوا تو دیکھا کہ بچہ اب بھی رو رہا ہے۔ آپؓ اس بچہ کی ماں پر خفاء ہوئے اور کہا تو بڑی بے رحم ہے، اب اس ماں نے کہا تم مجھے ڈانٹتے ہو اصل بات جو ہے اس کی تمہیں خبر ہی نہیں ہے، عمرؓ نے حکم دیا ہے کہ جب تک بچے کا دودھ نہ چھوٹے اس کو بیت المال سے وظیفہ نہ دیا جائے اس لئے میں زبردستی اس بچہ کا دودھ چھڑا رہی ہوں، جب حضرت عمرؓ نے اس عورت کا یہ جواب سنا تو آپ بے حد متأثر ہوئے اور فرمایا کمبخت عمرؓ تو نے نہ جانے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا؟ اور اسکے بعد فوراً اعلان کرا دیا کہ جس دن بچہ پیدا ہو اس کا وظیفہ اسی دن سے مقرر کیا جائے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ شام کے سفر سے واپس ہو رہے تھے کہ کسی مقام پر ایک خیمہ نظر آیا، جب آپ قریب پہونچے تو وہاں ایک عورت پر نظر پڑی۔ آپؓ نے اس عورت سے معلوم کیا کہ تم کو کچھ عمر کا حال معلوم ہے؟ عورت نے کہا ہاں وہ شام سے واپس ہو رہا ہے، مگر مجھ کو تو اس سے ایک حبہ (دانہ) بھی نہیں ملا ہے۔ آپ نے اس عورت سے کہا تم شام میں رہتی ہو اور وہ مدینہ میں۔ عمر کو اتنی دور کا حال کیونکر معلوم ہوسکتا ہے؟ اس پر عورت نے جواب دیا، اگر حال معلوم نہیں کر سکتا تو حکومت کیوں کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو بے ساختہ رو پڑے۔

عدل وانصاف اور مساوات وبرابری کے الفاظ آج ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ لیکن کیا تاریخ عالم میں کوئی ایک واقعہ بھی اس کی نظیر میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر فاروقؓ شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس طرح کہ آپ کا غلام اونٹ پر بیٹھا ہوا ہے اور آپ خود اونٹ کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں۔ کیوں؟ صرف اسلئے کہ اونٹ ایک ہی تھا، آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے چلے آرہے تھے۔ اتفاق سے بیت المقدس میں جب داخلہ کا وقت آیا تو وہ

آپ کے غلام کی باری کا وقت تھا۔

صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں اس طرح کے واقعات استثنائی حکم نہیں رکھتے بلکہ تاریخ وسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو سینکڑوں ہزاروں واقعات ملیں گے جن کو پڑھ کر آج کل کی دنیا میں ان کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا۔صحابۂ کرامؓ تو خیر آنحضرت ﷺ سے براہِ راست فیضِ تعلیم وتربیت اٹھائے ہوئے تھے۔

اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں واقعات جو تاریخ کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں ان میں غور وفکر کرو اور دیکھو کہ ان کے اسباب کیا ہیں؟ یہ غیر معمولی جوشِ عمل، یہ حسرت انگیز اخلاص وبے نفسی حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ کے باوجود یہ عاجزی وفروتنی، عقیدہ کی یہ پختگی اور کردار کی یہ بلندی یہ سب اوصاف کیا اس وقت پیدا ہوسکتے ہیں جبکہ انسان کے معتقدات اور اس کے اعمال وافعال کا تعلق براہِ راست ایک اعلیٰ ترین قدرِ حیات کے ساتھ نہ ہو۔

یہی وہ یقین تھا جس کے باعث حضرت عمرؓ باوجود اپنے تمام کمالات اور اعمالِ حسنہ کے بعض اوقات فرماتے تھے کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں عمرؓ کی جان ہے۔میں تو صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن بے مؤاخذہ چھوڑ دیا جاؤں۔

علاوہ ازیں اب ایک اور پہلو سے غور کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت اور طبیعت میں محبت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے اور اس بناء پر اس کو ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے، جس کو وہ اپنی امیدوں ارمانوں اور تمناؤں کا مرکز بنائے، اس کی یاد میں اسے لطف وسرور حاصل ہوتا ہو، اور اس کی غمِ عشق کی لذت وحلاوت کے مقابلہ آسائش راحت وعشرت ہر دو جہانی ہیچ نظر آتے ہوں۔ایک طرف انسان کی یہ فطرت کہ وہ محبوب تلاش کرتا ہے، اور دوسری جانب اس کی یہ محرومی اور بدنصیبی کہ وہ اس وسیع کارگاہ ہست وبود میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔غرض ہر اس چیز سے جس کا اس سے دور یا نزدیک کا تعلق یا رشتہ ہوتا ہے، ہر ایک سے محبت کرتا ہے اور دل لگاتا ہے، لیکن ہر انسان کی زندگی میں آخر ایک وقت آتا ہے، جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب تک اس نے جس چیز سے محبت کی تھی اس کی یہ محبت ناپائیدار تھی۔اس احساس کے بعد انسان میں تنہائی کا احساس شدید تر ہوجاتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو سب کچھ رکھنے کے باوجود اکیلا ہی پاتا ہے۔لیکن جس شخص کے دل میں خدا کی محبت ہوتی ہے، اور مذہب سے لگاؤ ہوتا ہے، وہ کبھی کسی حالت میں اپنے تئیں تنہا محسوس نہیں کرتا، ہر حالت میں خوش مطمئن اور مگن رہتا ہے، اور کبھی اس کے اندر بددلی آزردگی اور دل گرفتگی کا احساس پیدا نہیں ہوتا ہے۔اس پر اگر غم کا پہاڑ ٹوٹتا بھی ہے تو یہ بدحواس اور سراسیمہ نہیں ہوتا ہے۔

موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا دور ہے، بعض کوتاہ اندیش معلوم کرتے ہیں کہ اب بھلا مذہب کی ضرورت کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سائنس خواہ کتنی ہی ترقی کرے انسان بہرحال کبھی مذہب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔کیونکہ حقائقِ اشیاء کے متعلق ہمیشہ دو اہم بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ یہ چیز کیا ہے، اور دوسرا یہ کہ یہ کیوں ہے؟ ان میں سے پہلے سوال کا جواب سائنس کے دائرۂ اختیار وعمل میں ہے، اور دوسرے کا جواب صرف اور صرف مذہب دے سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی تکمیل دونوں ہی سوالات کے جوابات پر منحصر ہے۔اگر مذہب نے مدد نہ کی تو اندیشہ ہے کہ سائنس کی یہ حیرت انگیز ترقی ہی کہیں بنی نوعِ انسان کی عظیم اور ناقابلِ تلافی ہلاکت وبربادی کی باعث نہ بن جائے۔

☆☆☆

❑ درسِ عزیمت

سلطان العلماء اور علمائے سلاطین

تحریر: عبداللہ عمادی ترجمہ: سہیل احمد ندوی (استاد مدرسۃ العلوم الاسلامیہ)

نوٹ: پوری دنیا خاص طور پر عالم عربی میں اور اس میں بھی بالخصوص سعودیہ و امارات میں علماء کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ مضمون حسب حال معلوم ہوا، اس لیے اسے ترجمہ کرا کر شامل اشاعت کیا جا رہا ہے، ابھی گزشتہ دنوں امام حرم شیخ صالح آل طالب کو گرفتار کیا گیا، سلمان العودہ کی پھانسی کے لیے حکومت کے وکیل نے سفارش کی ہے، مصر میں ۷۵ بے گناہوں کو سزائے موت سنائی گئی، علمائے حق کو پابند سلاسل کیا جا رہا ہے، درباری علماء راہ عزیمت اپنانے کے بجائے شاہ کے ہر فیصلہ کو صاد کر رہے ہیں، اس صورت حال میں عز بن عبدالسلام، ابن تیمیہ اور احمد بن حنبل جیسے علماء کے کردار کو نمایاں کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ (مدیر)

شیخ عز بن عبدالسلام نے ان دعائیہ کلمات "اللهم أبرم لهذه الأمة أمر رشد، يعز فيه أهل طاعتك، ويذل فيه أهل معصيتك، ويؤمر فيه بالمعروف، ويُنهى فيه عن المنكر" پر اپنے اس خطاب کو ختم کیا، جس میں انھوں نے ملک صالح اسماعیل کی اس پلاننگ و منصوبہ بندی پر اعتراض کیا تھا، جس منصوبہ کے تحت بادشاہ نے صلیبیوں کے ساتھ صلح کو روا رکھا تھا، اور ان کو دمشق کے اندر مختلف علاقے عطا کئے تھے، اور اسلحوں کی بیع و شراء کی نیز مزید کمک کی اجازت دی تھی۔

سلطان العلماء شیخ عز بن عبدالسلام نے نہایت پر جوش و پر مغز اور ولولہ انگیز خطاب کے ذریعہ فرنگیوں کے ساتھ صلح اور ان کے ساتھ بیع و شراء کے معاہدے کی کھل کر مذمت و تردید کی، اور پھر خطاب کے آخر میں حسب معمول ملک صالح اسماعیل کے لئے دعائیہ کلمات بھی نہیں فرمائے، تو وہ چیں بہ جبیں ہو گیا، اور ان کی نظر بندی کا حکم صادر کر دیا۔

شیخ عز بن عبدالسلام تاریخ اسلامی کے روشن ابواب میں سے ایک مکمل باب ہیں، ان کا شمار ان علماء کی جماعت میں سرفہرست ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی شناخت اور اپنا تعارف و امتیاز اپنے ذاتی جوہر و کردار کو بنایا نہ کہ تصنیفات و تالیفات کو۔

حالانکہ وہ اپنی علمی سرگرمیوں اور کاوشوں اور وفور علمی میں اپنی مثال آپ ہیں، لیکن ان کی یہ علمی سرگرمیاں اور ان کا یہ علمی انہماک بھی ان کو ظالم و جابر حکام کے ظلم و زیادتی کے وقت ان پر تنقید کرنے سے نہیں روکتا، اور اپنے زمانہ کے اسلام دشمن صلیبیوں اور صہیونی طاقتوں اور منگولوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں ان کو ذرا بھی تأمل نہ ہوتا، انھوں نے ان خطرات کا بے باکانہ انداز میں مقابلہ کیا اور سخت و صریح تنقیدیں کیں۔

شیخ کی سیرت اور ان کا موقف و کردار آج بھی اس لائق ہے کہ اس کو تاریخ کی سلوٹوں سے نکال کر امت کے سامنے پیش کیا جائے، اور اس کو نمایاں کیا جائے، کیوں کہ ان کے بعد بہت سے ایسے علماء کا ظہور ہوا جن کا تعارف ہی علماء السلاطین (درباری علماء) کے طور پر ہوا، جنہوں نے اپنے اور دوسرے اپنے ماتحتوں کے اس دین متین کو چند کوڑیوں اور سکوں کے خاطر فروخت کر ڈالا، اور تعجب تو اس بات پر ہے کہ ان کے فتاوی اور ان کا علم ہر

دنیادار حاکم اور لیڈر کے گھر کی لونڈی کے مثل ثابت ہوا، حکام ان سے جس طرح چاہیں فتوے لکھوائیں اور ان سے اپنی مادی خواہش کے مطابق کام لیں۔

عز بن عبدالسلام اور بادشاہ کا مقابلہ:

ہماری اسلامی تاریخ کا ایک اہم اور دلدوز واقعہ یہ ہے کہ امت مسلمہ پر ایک دور ایسا بھی آیا کہ اس کے لئے اپنے وجود کی حفاظت مشکل تھی، اور وہ ایک خطرناک چیلنج اور سنگین خطرہ سے نبرد آزما تھی، اور منگول افواج کی وحشیت و بربریت سے سکون کا سانس نہیں لینے دے رہی تھی، ایسے پر آشوب و پُرفتن دور میں ایک مرد مجاہد، عالم ربانی شیخ عز بن عبدالسلام نے برملا حق کے اظہار کا فریضہ انجام دیا، انھوں نے منگولوں کے خطرہ کے سدِّ باب کے لئے عوام اور اس سے پہلے خود ملک قطز کو مقابلہ کی آمادگی کے لئے تیار کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا، اور اس کو مقابلہ کے لئے مجبور کیا، ان منگولوں نے عالم اسلامی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، اور بغداد کے اندر خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا تھا، بغداد منگولوں کے ہاتھوں ایسا تباہ و برباد ہوا جس سے آج تک وہ بحال نہ ہو سکا، قاہرہ بھی تقریباً اس حملہ کی زد میں آچکا تھا۔

چنانچہ بادشاہ نے منگولوں کے ساتھ اس فیصلہ کن معرکہ کے لئے عوام سے مال کی فراہمی کا مطالبہ کیا، تو اس دن بھی سوائے مرد غیور عز بن عبدالسلام کے کسی بھی عالم نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ تماشا بین بنے رہے، لیکن عز بن عبدالسلام اس کے موقف میں آڑے آئے اور کہا کسی سے کوئی مطالبہ نہ کیا جائے، سب سے پہلے اس مقابلہ کے اخراجات کی تکمیل کے لئے بیت المال ذمہ دار ہوگا، اور اس کے بعد مزید ضرورت اگر محسوس کی جائے گی تو اس کے ذمہ دار بڑے بڑے تاجر اور دولت مند ہوں گے، اور اس طرح سے لشکر کی تیاری میں تمام لوگ برابر کے شریک ہوں گے۔ اور پھر بھی یہ اموال اگر ناکافی ثابت ہوں تو بقیہ لوگوں پر ٹیکس حسب حیثیت نافذ کیا جانا چاہیئے۔

تب ملک قطز نے اپنے فیصلہ کو واپس لیا، اور اس کو ان کی بات تسلیم کرنی پڑی، اور پھر اس کے بعد فیصلہ کن جنگ عین جالوت میں ہوئی، اور منگولوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا۔

شیخ عز الدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی، جس کا سلاطین وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، بارعب اور خوددار تھے، انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا درباری بننا گوارا نہیں کیا، جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے، اور اس کو صحیح مشورہ دیا، اور اس کی اور اسلام، مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

شیخ عز الدین صرف سلاطین ہی کے مقابلہ میں جری اور حق گو نہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی اسی طرح بے باک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں، کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانۂ قیام میں ان سے ایک فتوی میں غلطی ہوگئی تو انہوں نے اعلان کروا دیا کہ جس کو ابن عبدالسلام نے فلاں فتوی دیا ہو، وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے۔

شیخ علمی و نظری طور پر اس بات کے بھی قائل تھے، کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بدعات اور گمراہیوں کی علانیہ مخالفت وانکار علماء کا فریضہ ہے، اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات اور شدائد بھی برداشت کرنے چاہئیں، اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

الملک الأشرف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کی جماعت میں سے ہیں، اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر ہیں۔ وہ لشکری جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار نہ ہو، وہ لشکری نہیں ہے، ان کا خیال تھا کہ علم و زبان علماء کا ہتھیار ہیں، اسلئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی

تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

اللہ نے ہم کو اپنے دین کی مدد کے لئے جہاد وجدو جہد کا حکم دیا ہے، اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم کا ہتھیار اس کا علم اور اس کی زبان ہے، جیسا کہ بادشاہ کا ہتھیار اس کی تلوار اور تیر وسنان ہے تو جس طرح بادشاہوں کے لئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں، اسی طرح علماء کے لئے اہل زیغ وضلال اور مبتدعین سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

درباری علماء حکام کے حاشیہ بردار ہیں:

آج کا فالج زدہ نظام بھی عبدالسلام کے زمانہ سے کچھ الگ نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کرپشن ہے۔

یہ امت مبعوث کی گئی ہے پوری دنیا کی قیادت وہدایت کے لئے لیکن آج اسلامی ممالک کی خانہ جنگی ایک واقعاتی اور مشاہداتی چیز ہے، درباری علماء کے جھنڈ وقتاً فوقتاً صابن کے جھاگ کے مانند بلبلوں کی شکل میں اٹھتے رہتے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ وہ حکام اور زعماء کے دسترخوان کے طفیلی اور حاشیہ خور ہیں، وہ خود اپنا اور دوسروں کا بھی دین اس کمتر اور حقیر دنیا کے بدلہ فروخت کررہے ہیں۔

حکام اور لیڈران کے حسبِ خواہش فتوے ڈھالنے کا ہنر بھی ان کو بڑے ہی عجیب وغریب طریقہ سے آتا ہے، ان کا ہر فتوی قیمت پر منحصر ہوتا ہے۔

ان کو مال ومتاع کا اور منصب وجاہ کا جھانسہ دے کر ان سے جو چاہے لکھوالیا جائے۔

ایسے درباری علماء پر شیخ محمد الغزالی نے بڑے ہی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جن کا خاص مشغلہ علم دین تھا، اور ان کی پوری کی پوری عمر دفتر کے دفتر سیاہ کرنے میں کٹی ہے، انھوں نے جزئیات وفروعیات پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ان میں سے کسی کے بھی نوک قلم سے کمیونزم، صہیونیت اور صلیبیت کے خلاف ایک حرف تک نہیں نکل سکا، ایسے موقعوں پر ان کے لبِ اظہار پر تالے اور زبانِ قلم پر چھالے پڑ جاتے ہیں، اس جگہ آکر ان کی زبانیں قوت گویائی کھو بیٹھتی ہیں، اور گونگی ہوجاتی ہے، امت کے درمیان چھوٹی موٹی پھیلی ہوئی غلطیوں پر تو ان کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے، لیکن اس دین کے پشتینی اور ازلی دشمن جو اسلام کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں، ان اعدائے اسلام کے لئے ان کا مہر سکوت نہیں ٹوٹتا، اور نہ کوئی نوٹس لیا جاتا ہے۔

آخر کس دُھن اور کیف ومستی میں وہ لوگ جی رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ آج امت جن حالات سے گزر رہی ہے، اور جو سنگین مسائل اس کو درپیش ہیں اس کی دو وجہ ہیں پہلی وجہ حق گو اور بیباکانہ گفتگو کرنے والے علماء سے دوری واجتناب، دوسری وجہ، دنیادار اور سیاسی حکام اور لیڈران سے نسبت وقربت۔

شیخ محمد الغزالی فرماتے ہیں، یورپ اپنے حکام اور لیڈران کو اپنا دست نگر اور اپنے قبضۂ قدرت میں رکھنے میں ہم سے سبقت لے گیا ہے، ان میں سے بعض کو تو ہنگامی بغاوتوں میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے یا پھر ان کے لئے ایسے سخت اور کڑے اصول وقوانین نافذ کردیئے جاتے ہیں اس لیے وہاں حکومت کی حیثیت ایک عام خدمت سے زیادہ نہیں ہوتی، ان کی بڑی دقت نظری کے ساتھ نگرانی کی جاتی ہے اور ذرا بھی شک ہونے پر ان کو کھدیڑ دیا جاتا ہے، چہ جائیکہ ان کا اکرام کیا جائے۔

اس کے برعکس مشرق اسلامی کا حال یہ ہے کہ سیاسی فساد اس کے چوتھائی حصہ میں سرایت کرچکا ہے، اور علوم دینیہ اور شریعت کا فہم رکھنے والے درباری علماء کا موقف ہی خوف وہراس کا ذریعہ بن رہا ہے، کیوں کہ ان جیسے درباری علماء کو حکام کے تلوے چاٹنے اور ان کی جوتیاں سیدھی کرکے اپنے آپ کو مقربین اور اپنے آپ کو اخص الخواص میں شامل کرنے کا عجیب وغریب فن آتا ہے۔

کواکبی کا کہنا ہے کہ سیاسی استبداد منحصر ہے دینی استبداد پر۔ ہر سیاسی ظلم وجور کرنے والے کے ساتھ ایک ایسی مقدس صفت جوڑ دی جاتی ہے جس کے ذریعہ اللہ کے ساتھ شرک کیا جاتا ہے، یا پھر اس کو وہ مقام دے دیا جاتا ہے جو اللہ سے حقیق تعلق رکھنے والے کو دیا جاتا ہے، اور اتنا نہیں تو کم از کم اس کو خدام دین کی فہرست میں ضرور شامل کر دیا جاتا ہے، پھر وہ اللہ کے نام کا سہارا لے کر عوام الناس پر اور لوگوں پر ظلم کا معاون ومددگار بنتا ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ رعایا کا بگاڑ منحصر ہے بادشاہوں کے بگاڑ پر، اور بادشاہوں کا بگاڑ موقوف ہے علماء کے بگاڑ پر، اگر اس طریقہ کے درباری علماء سوء نہ ہوں تو دین کو نقصان پہونچانے والے وسائل بھی کم ہو جائیں، اور نقصانات دین کے اندیشے اور خدشات ختم ہو جائیں۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کو فتنوں کا سامنا اور مقابلہ ہے، ہر ایک ان مصائب ومشکلات سے جوجھ رہا ہے، لیکن علماء کا ان جیسی چیزوں میں پھنس کر رہ جانا امت کے لئے واقعی کسی زہر ہلاہل سے کم نہیں، جو امت خلافت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد سے اب تک بحال نہ ہوسکی ہو اور اوپر سے اس پر ان مظالم کا انبار، خدا جانے وہ کیسے جانبر ہو سکے گی۔

ہم چشم دید گواہ ہیں، اور آئے دن واقعات ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، کہ سچے علماء اور محققین کو مختلف انواع واقسام کے فتنوں اور آزمائشوں کا سامنا ہے، بسا اوقات عالم اسلامی کے مختلف خطوں میں ان کے ساتھ بڑا ہی کربناک اور ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود جب جب بھی درباری علماء سر اٹھائیں گے، اور فتنوں کو ہوا دیں گے تب تب اللہ عزوجل عزبن عبدالسلام، حسن بصریؒ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم جیسے مضبوط علم وادب کے پہاڑ ان کا سر کچلنے کے لئے کھڑا کر دیں گے، وہ اپنے اپنے قلموں کو شرر بار اور تیغ براں ثابت کرتے رہیں گے، اپنی زبان غیرت اور حمیت قلم سے نکلنے والی شرر بار تنقیدوں کی آگ میں انھیں جھلسائیں گے اور شرمسار کریں گے۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس امت کی شادمانی و کامرانی، صلاح وتقوی اور اس کے علماء کی بیدار مغزی میں مضمر ہے، علماء کی اس حیثیت کے متعلق ایک طویل حدیث میں اللہ کے حبیب نے فرمایا ہے، کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء مال و دولت کا وارث نہیں بناتے، وہ تو وراثت میں علم چھوڑ کر جاتے ہیں جس نے اس کو حاصل کر لیا گویا کہ اس نے سارے زمانہ کی خیر حاصل کر لی۔

اس فرمان کے بعد تو علماء کے مقاصد بہت بلند ہونے چاہییں اور ان کو ذمہ داریوں کا بخوبی احساس ہونا چاہیے، پھر بھی اگر بعض علماء اخلاقی گراوٹ ایک ثبوت دیں اور امراء کے دربار میں تملق کریں، تو اکثریت کے مقابلہ میں ان کا تملق کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، کیوں کہ اس امت کے اندر عزبن عبدالسلام جیسے اشخاص جنم لیتے رہیں گے، اور اس امت کی کامیابی وکامرانی کے لئے اس کو شاہ کلید عطا کرتے رہیں گے، اور اس طرح یہ امت صلاح وفلاح کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گی، اور اس کی مجد وشرافت کی کہانی بار بار دہرائی جاتی رہے گی، اللہ ہم سب کا حامی ہو، وہی بہترین کارساز ہے، (فنعم المولیٰ ونعم النصیر)۔ آمین۔

☆☆☆

نام کتاب: امت محمدیہ-امتیازات وخصوصیات

تعارف و تبصرہ

تبصرہ نگار: محمد خالد ضیا صدیقی ندوی

مؤلف: مولانا محمد قمر الزماں ندوی
مرتب: محمد فرید حبیب ندوی
ضخامت: 200
قیمت: 150
سن اشاعت: اگست 2018
ناشر: مدرسہ نظامیہ دار القرآن، دگھی، گڈا، جھارکھنڈ

جس طرح مذہب اسلام بے شمار خصوصی امتیازات کی بنا پر دوسرے مذاہب میں اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے، اسی طرح امت محمدیہ اپنے بعض امتیازات وخصوصیات کی بنا پر دیگر امتوں میں امتیازی شان کی حامل امت ہے؛ لیکن افسوس ہے کہ آج یہ امت نہ اپنے امتیازات وخصوصیات سے واقف ہے، اور نہ ہی اپنی ذمے داریوں سے آگاہ، جس کا نتیجہ ہے کہ اقوام عالم کی نگاہ میں بے وقعت و بے وزن ہو کر رہ گئی ہے۔

زیر نظر کتاب امت محمدیہ کے امتیازات وخصوصیات سے بحث کرتی ہے، اور یہ بتاتی ہے کہ یہ امت اپنی ذمے داریوں سے اس وقت تک صحیح معنوں میں عہدہ برآ نہیں ہوسکتی جب تک اسے اپنے امتیازات وخصوصیات کا ادراک نہ ہو۔

یہ کتاب دراصل ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ ندائے اعتدال (علی گڑھ) میں شائع ہوئے، پھر مؤلف کی خواہش پر ندائے اعتدال کے معاون مدیر رفیق گرامی محمد فرید حبیب ندوی نے کچھ ضروری اور گراں قدر اضافوں کے بعد انھیں کتاب کی شکل میں ترتیب دیا، فاضل مرتب کے قلم سے جو مضمون ضمیمے کے طور پر شامل کتاب ہے، بہت خوب، نہایت ہی جامع اور دریا بکوزہ کا مصداق ہے کتاب کن مباحث پر مشتمل ہے؟ اس کے مندرجات ومشمولات کیا ہیں؟ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مرتب لکھتے ہیں:

''کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، اور حقیقت میں ابتدائی تین ابواب ہی مؤلف کے قلم سے ہیں، اور وہی روح کتاب ہیں بعد کے ابواب مؤلف نے مختلف جگہوں سے منتخب کر کے شامل کیے ہیں کہ وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے امت کے امتیازات سے ہی واقف کراتے ہیں۔

پہلے باب میں امت محمدیہ کی اکیس خصوصیات بیان کی گئی ہیں، دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات ہیں، تیسرے باب میں امت محمدیہ کے علما کے امتیازات سے بحث کی گئی ہے، آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں مرتب کا ایک مضمون ہے، چوتھے باب میں کچھ ایسی سورتوں اور آیتوں کا ذکر ہے، جو اس امت کے لیے خصوصی عطیہ ہیں، پانچواں باب امت محمدیہ کو دیے گئے مخصوص اذکار سے بحث کرتا ہے، چھٹے باب میں ان مخصوص دعاؤں کو ذکر کیا گیا ہے جن سے امت کو نوازا گیا ہے، اور ساتویں باب میں اس امت کو دیے گئے مسنون اعمال کا بیان ہے''۔(ص:15)

کتاب ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی صاحب (رئیس مرکز الندوۃ للدرسات الاسلامیہ، کناڈا) کے کلمات تبریک، مولانا محمد علاء الدین ندوی صاحب (استاذ دار العلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ) کے مقدمے اور مفتی رحمت اللہ ندوی صاحب (استاذ دار العلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ) کی تقریظ سے مزین ہے۔

کتاب کے موضوع، اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت وضرورت کے حوالے سے فاضل مقدمہ نگار لکھتے ہیں:

''موضوع اگر چہ نیا نہیں ہے، اس انداز کی خدمت متعدد مصنفین اور اہل ذوق نے پہلے بھی انجام دی ہے؛ مگر آج اس کتاب کی اہمیت یوں ہے کہ دور حاضر کے مسلمان مادیت کے نرغے میں پھنس کر اپنے دین کی عظمت، اپنی انفرادی حیثیت اور امت کے مقام ومرتبے سے نا آشنا ہوگیا ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ اس امت کے افراد کو امت کی خصوصیات ذہن نشیں کرائی جائیں، ان خصوصیات کے حوالے سے اس پر عائد ہونے والی ذمے داریوں سے آگاہ کیا جائے؛ تاکہ وہ اپنی حیثیت واہمیت سمجھ کر دنیا کی ہدایت وامامت کا فریضہ انجام دے جس کی خاطر اسے برپا کیا گیا ہے''۔(ص:9)۔

کتاب اپنے موضوع کو محیط ہے، قرآن وحدیث کی روشنی سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے، علمائے امت کی پر مغز تحریروں سے لبریز ہے،

کتاب میں حوالے کا التزام کیا گیا ہے، مصادر ومراجع اور اصل مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے، مباحث میں تنوع بھی ہے اور پھیلاؤ بھی بعض مباحث خالص علمی اور تحقیقی نوعیت کے ہیں، جب کہ بعض پر نصح وخیر خواہی اور اصلاح ودعوت کی چھاپ غالب ہے، کتاب کا آخری حصہ اذکار وادعیہ اور مسنون اعمال کی خوشبوؤں سے معطر ہے، جو عوام کے لیے بطور خاص فائدہ اٹھانے کی چیز ہے۔

موضوع کے ساتھ انصاف کرنے اور اس کو خوش اسلوبی سے نباہنے کے لیے فاضل مؤلف نے بڑی محنت اور جدو جہد کی ہے۔ موضوع کی تنقیح وتہذیب میں کافی عرق ریزی سے کام لیا ہے، تلاش وجستجو کے تھکا دینے والے سفر کو بخوشی برداشت کیا ہے، کسی خاص موضوع کے لیے منتشر جگہوں سے کارآمد چیزیں جمع کرنا اور مفیدِ موضوع مواد کا مہیا کرنا (بقول مولانا ماہر القادری مرحوم)'' ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لیے فکر سلیم، نگاہ عمیق اور وجدان صحیح درکار ہے..... دریا اور تالاب سے پانی ہر کوئی لے سکتا ہے؛ لیکن پانی کی ایک ایک بوند کو مقطر کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے فن کارانہ مہارت کی ضرورت (ہوتی) ہے''۔ خوشی ہے کہ یہ کتاب اس فن کارانہ مہارت کا شاندار مظہر ہے۔

کتاب کی زبان شستہ اور رواں ہے، انداز بیان سادہ مگر دلکش و دل نشیں ہے۔ اعتدال وتوازن کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ ہر اعتبار سے نمونے کی چیز ہے، ہم یہاں صرف ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جس سے اسلام کا معتدلانہ مزاج بھی ظاہر ہوگا اور فاضل مؤلف کے طرز نگارش کا نمونہ بھی سامنے آئے گا:

''محبت اور عداوت میں عام طور پر انسانوں میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے، محبت انسان سے بصیرت کے ساتھ بصارت بھی چھین لیتی ہے، انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے تو اس کی برائیوں میں بھی بھلائیاں نظر آنے لگتی ہیں، اور یہی انسان جب دشمنی پر آتا ہے تو دشمنی میں رائی جیسی برائی بھی پہاڑ نظر آنے لگتی ہے، اور دشمن میں پہاڑ جیسی خوبی ہو تو وہ بھی رائی سے حقیر نظر آتی ہے..... اسلام اس سلسلے میں بھی اعتدال کی راہ پر گامزن رہنے کی تعلیم دیتا ہے، غلو آمیز محبت یا غلو آمیز نفرت وعداوت کا اسلام مخالف ہے، اسلام کی پاکیزہ تعلیم یہ ہے کہ دشمن بھی ہو تو اس کی غیبت اور بہتان تراشی میں مت پڑو، اور اگر کوئی دوست ہو تو اس کو مرکز عقیدت سمجھ کر اس کی تعریف میں غلو اور تملق وخوشامد مت کرو''۔ (ص:38_39)

مولانا محمد قمر الزماں ندوی صاحب علمی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں، وہ باکمال مدرس، اچھے خطیب اور پختہ قلم کار ہیں، استقامت ومداومت کا استعارہ ہیں، قدرت نے مرنجا مرنج طبیعت سے نوازا ہے، حاضر جوابی، شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی کی خوبصورت تصویر ہیں، بڑے دراک اور اخاذ ذہن کے مالک ہیں، اخذ واقتباس کا انھیں اچھا سلیقہ ہے، ان کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور متنوع بھی، قلم وقرطاس سے ان کا مضبوط اور اٹوٹ رشتہ ہے، ان کی کئی کتابیں علمی حلقوں سے داد تحسین حاصل کر چکی ہیں، لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں، علم کی مختلف شاخوں پر ان کا قلم بڑی تیزی سے دوڑتا ہے اور علمی سرمایے میں روز انہ اضافہ کرتا رہتا ہے، ان کے قلم کی حرکت ان کے جسم ودماغ دونوں کو حرکت میں رکھتی ہے۔

ہر چند کہ کتاب اپنے موضوع پر شاندار اور بہت عمدہ ہے، طباعت معیاری، ورق نفیس اور سرورق دیدہ زیب ہے؛ ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ رہے، لیکن ہے بہر حال ایک انسانی کاوش، جس میں سہو وخطا کا امکان عین ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ پوری کوشش کے باوجود پروف اور رموز کی غلطیوں سے پاک نہیں رہ سکی... صفحہ:81-80 پر خاتم النبیین کی بجائے خاتم النبین کئی جگہوں پر نظر آتا ہے، صفحہ:158 پر اللھم اصحَبنا کی جگہ اللھم أصحِبنا ہو گیا ہے..... عربی املا کی صحت کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے، مثلا: صفحہ:160 پر شيء کی بجائے شیء نظر آتا ہے حالانکہ یہ غلط ہے، قواعد املا کی رو سے نقطے والی 'ي' ہونی چاہیے اسی طرح صفحہ: 104 پر شیخ علی المہائمی کمپوزر کی کرم فرمائی سے شیخ علی المیاتمی بن گئے ہیں، کتاب میں جا بجا قرآنی آیات بکھری ہوئی ہیں؛ لیکن ان کا رسم الخط مصحف کے رسم الخط سے میل نہیں کھاتا، احتیاط اسی میں ہے کہ آیات قرآنی حتی المقدور قرآنی رسم الخط ہی میں لکھی جائیں۔

بہر حال ان معمولی غلطیوں کی وجہ سے کتاب کی قدر وقیمت میں کوئی کمی نہیں آتی، اس کا مطالعہ خواص وعوام دونوں کے لیے یکساں مفید ہوگا، ہم اس قابل قدر کتاب کو منظر عام پر لانے کے لیے مؤلف، مرتب اور ناشر تینوں کی تحسین وستائش کرتے ہیں اور اس پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

آخری صفحہ

تم اس اللہ کو یاد نہیں کرتے جس نے تم کو پیدا کیا ہے؟

(م۔ق۔ن)

مشہور بزرگ عارف باللہ حضرت سہیل بن عبداللہ تستریؒ کہتے ہیں کہ میں جب بہت چھوٹ تھا تبھی سے اپنے ماموں محمد بن سوارؒ کو رات میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا تھا۔ایک دن میرے ماموں مجھ سے کہنے لگے ''تم اس اللہ کو یاد نہیں کرتے جس نے تم کو پیدا کیا ہے؟'' میں نے کہا کیسے یاد کروں؟ فرمایا جب بستر پر سونے جاؤ لیٹے لیٹے دل ہی دل میں زبان ہلائے بغیر تین بار کہو ''اللہ میرے ساتھ ہے اور اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اللہ میرا گواہ ہے''، چنانچہ میں نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا، جب کچھ دن گزر گئے اور میں نے اپنے ماموں کو بتایا تو وہ کہنے لگے ''اب ایسا ہی سات بار کرو''، چنانچہ میں نے ہر رات سات بار کہنا شروع کر دیا، جب کچھ دن اور گزر گئے تو ماموں نے فرمایا کہ ''اب گیارہ بار کہا کرو''، چنانچہ میں گیارہ بار کہنے لگا۔میرے دل میں اس کی لذت وحلاوت بیٹھ گئی اور اسے کہنے میں لطف آنے لگا۔ایک سال تک ایسا ہی رہا۔پھر میرے ماموں کہنے لگے۔

إحفظ ما علمتك ودُم عليه إلى أن تدخل القبر فانه ينفعك في الدنيا والآخرة (جو میں نے تمہیں سکھایا ہے اسے محفوظ رکھو اور اس پر مرتے دم تک قائم رہو کیوں کہ یہ تمہیں دنیا و آخرت دونوں جگہ نفع دے گا)۔

اس طرح میں چند سالوں تک کرتا رہا۔میں نے اپنے اندر اس کی حلاوت ومٹھاس پائی، پھر ایک دن میرے ماموں مجھ سے کہنے لگے ''اے سہیل! اللہ جس کے ساتھ ہو، اللہ جسے دیکھ رہا ہو اللہ جس کا گواہ ہو، کیا وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا؟ دیکھو اللہ کی معصیت (نافرمانی) سے ہمیشہ بچنا''۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی سے حضرت سہیل بن عبداللہ تستریؒ کے دل ودماغ میں اللہ کی معرفت وخشیت بیٹھ گئی اور بڑے ہو کر وہ کبار عارفین میں شمار ہوئے۔

اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق لینا چاہیے کہ بچے کی تعلیم وتربیت کی فکر شروع ہی سے کرنی چاہیے، کیوں کہ ابتدا میں جیسے تربیت ہوتی ہے وہی اثرات جوانی اور بڑھاپے میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی لئے مشہور کہاوت ہے کہ بچپن کی چیزیں پچپن تک رہتی ہیں، یعنی ۵۵ سال تک وہ چیزیں اسے یاد رہتی ہیں اور وہ عادات واخلاق اس پر ظاہر اور نمایاں ہوتے ہیں۔

اس لئے آپؐ نے حکم دیا کہ اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو اور دس سال ہونے پر نماز نہ پڑھنے پر مارو اور ان کا بستر الگ کر دو (ابوداؤد)۔

اس لئے علماء کہتے ہیں کہ بچہ یا بچی جب بولنے لگے تو اسے اللہ اللہ بلوایا جائے۔اسے کلمہ طیبہ سکھایا جائے۔اس کے سامنے اللہ کا نام آئے۔رسول اللہ ﷺ کا نام آئے۔انبیاء کرام کا تذکرہ آئے۔صحابہ اور بزرگان دین کا تذکرہ آئے۔اللہ والوں کا نام آئے۔نماز روزہ زکوۃ اور حج کا اور قرآنِ مجید کی تلاوت کا ذکر آئے۔ذکر وتسبیح کے الفاظ آئیں نہ کہ فلمی گانوں کے بول، فلمی لوگوں کے نام اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کے نام، کیوں کہ اس طرح کی چیزیں آنے سے دینی ماحول کیسے پیدا ہوگا، بچے نیک اور اچھے کیسے بنیں گے؟ آج نوے فیصد مسلمانوں کے یہاں بچوں کی تربیت غیر اسلامی اور غیر مذہبی انداز سے ہو رہی ہے، جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ظاہر ہے، اگر ہم نے بچوں کی تربیت اسلامی نہج پر نہیں کی تو مستقبل میں اس کے مزید بھیانک نتائج سامنے آئیں گے۔ اس لئے اس پہلو پر ہم سب کو دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆